تحقیق وتنقید

قسط نمبر ①

# سندِ کتاب میں منہجی غلطی کا جائزہ

محمد خبیب احمد (ادارہ علوم اثریہ، فیصل آباد)

محدثینِ عظام نے صیانتِ حدیث کے لیے سند کا قابلِ رشک اہتمام کیا جس کی اہمیت کا کسی بھی انصاف پسند کو انکار نہیں۔ مگر اس سے یہ کشید کرنا کہ تمام مقامات پر حدیث پرکھنے کے بس یہی اصول ہیں، ہمارے نزدیک یہ ایک منہجی غلطی ہے جس کی وضاحت ہم اپنے مضمون ''سندِ کتاب اور منہجِ محدثین'' (مطبوع ہفت روزہ الاعتصام، لاہور۔ جلد: ۶۷، شمارہ: ۲۴، ۲۵) میں کر چکے ہیں۔ اس کا اکثر حصہ مولانا زبیر علی زئی رحمہ اللہ کی زندگی میں لکھا جا چکا تھا جو درحقیقت ان کے مضمون ''جمہور محدثین اور مسئلہ تدلس'' کے رد میں ایک حصے کا جواب تھا۔ ان کا مضمون تین اقساط میں ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، حضرو (شمارہ: ۱۰۱-۱۰۳، جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ ان کی علالت اور پھر رحلت کے بعد اس سلسلے کو ختم کرنا مناسب سمجھا۔ اور تقریباً سوا دو سال بعد نہایت مثبت انداز میں (جس کی گواہی اہلِ علم دیں گے، ان شاء اللہ۔ بلکہ مولانا مرحوم سے متعلق حصے کو ویسے ہی علیحدہ کر لیا!) چند اضافوں کے ساتھ ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) میں اشاعت کے لیے بھیج دیا۔

محدثِ جلیل علامہ حافظ زبیر علی زئی (نور اللہ مرقدہ و تقبل اللہ حسناته و جهوده) کا شمار پاکستان کے نامور علماء اور محققین میں ہوتا ہے جس کی شہادت وسعتِ مطالعہ کی غماز ان کی تالیفات اور تحقیقات دیتی ہیں۔

وسعتِ علمی کے باوجود مصطلح الحدیث کے بعض مسائل میں ان سے شذوذ سرزد ہوئے۔ اگر یہ اُصول ان کی شخصیت تک محدود رہتے تو ہمیں بھی اعتراض نہ ہوتا کہ دیگر اہلِ علم کے شذوذ معروف ہیں۔ مگر جب اُنھوں نے اپنے اُصولوں پر محدثین کے اُصول کا لیبل چسپاں کیا تو ہمیں بھی اظہارِ حق کے لیے قلم کو جنبش دینا پڑی جس پر راقم الحروف کی کتاب ''مقالاتِ اثریہ'' کے صفحات گواہ ہیں۔

ایسے ہی ان کے ایک تفرد کا دفاع کرنے اور راقم کے مضمون کی تردید کے لیے مولانا مرحوم کے شاگردِ خاص مولانا حافظ ندیم ظہیر صاحب نے ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، حضرو (شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، مئی تا اگست ۲۰۱۵ء) میں ایک مضمون بہ عنوان ''مقالہ ''سندِ کتاب اور منہجِ محدثین'' پر ایک نظر'' لکھا جو عبارت ہے نفسِ مضمون کے جواب کی بجائے سیاق وسباق کو نظر انداز کرتے ہوئے قلم کاری سے۔

راقم السطور نے اسے قابلِ التفات نہ سمجھا۔ مگر جب ان کا مضمون سوشل میڈیا پر پھیلا دیا گیا اور مولانا مرحوم کے بعض شاگرد حسبِ افتادِ طبع راقم کو مطعون کرتے ہوئے مولانا ندیم اور مولانا زبیر صاحبان کے بعض مضامین کے جواب کا نہایت شدت سے اصرار کرنے لگے۔

بنا بریں ہم اپنے گزشتہ مضمون ''سندِ کتاب اور منہجِ محدثین'' کو مزید آگے بڑھا رہے ہیں۔ جس کے حصہ دوم میں مولانا ندیم صاحب کے غلط طرزِ عمل کی حقیقت پیش کی جائے گی، ان شاء اللہ۔

### ۱۔ کتاب کی نسبت پر اجماع:

مولانا زبیر علی زئی نے العلل الکبیر کا انکار تو کر دیا مگر لطف یہ ہے کہ وہ خود بھی اس اسلوب پر قائم نہ رہ سکے کیوں کہ جگہ جگہ محدثین کے مسلک سے ٹکراؤ پیدا ہو رہا تھا۔ بلکہ ''سلف صالحین کے متفقہ پر چار'' اور ''اجماع کی برتری'' کے اپنے ہی دعوے کھوکھلے محسوس ہو رہے تھے۔ بنا بریں وہ خاصی اضطرابی کیفیت میں رہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

العلل الكبير للترمذي کا آج تک کسی نے انکار نہیں کیا،

خواہ وہ متقدمین میں سے ہوں یا متاخرین اور معاصرین میں سے۔ ہمارے فاضل دوست بھی اپنے استادِ گرامی کے موقف کی ہم نوائی میں کسی عالم کو پیش نہیں کر سکتے۔

یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہے کہ امام بیہقی نے امام ترمذی کی اصل کتاب سے استفادہ کیا۔ اسی طرح ان کے معاصر حافظ ابن عبدالبر اور ان کے بعد حافظ ابن عساکر بھی مستفیض ہوئے۔ پھر ابو طالب قاضی نے جامع ترمذی کی ترتیب کے مطابق اسے ڈھالا، تاکہ اس سے استفادہ آسان ہو جائے۔ انھی کا مرتب کردہ نسخہ شائع شدہ اور متداول ہے۔

موصوف کے علاوہ آج تک کسی قابلِ اعتبار اور صاحبِ علم و دانش کا اس سے انکار نہ کرنا اس پر اجماع کی دلیل ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ آپ سے پہلے بھی کسی نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے؟ ان کی خدمت میں ہم شیخ مکرم ہی کے اقوال پیش کیے دیتے ہیں:

①..... ''اجماع کا ثبوت دو طریقوں سے حاصل ہوتا ہے:

اول: محدثین و علمائے اہل سنت کی تصریحات سے، مثلاً: ابن المنذر کی کتاب الاجماع وغیرہ۔

دوم: تحقیق کے بعد واضح ہو جائے کہ فلاں مسئلہ ایک جماعت سے ثابت ہے اور اس دور میں ان کا کوئی مخالف معلوم نہ ہو، لہٰذا یہ اجماع ہے۔''

(تحقیقی مقالات از حافظ زبیر علی زئی: ۵/ ۱۰۸، ماہ نامہ الحدیث، شمارہ: ۹۱، ص: ۴۳، ۴۴، دسمبر ۲۰۱۱ء)

العلل الکبیر بھی ثبوت اجماع کے اس دوسرے طریقے میں شامل ہے کہ وہ سبھی محدثین سے ثابت ہے، اس کا کوئی مخالف نہیں۔

شیخ مکرم ایک اور مقام پر رقم طراز ہیں:

②..... ''اس حدیث کو درج ذیل محدثین نے صحیح قرار دیا ہے: ۱۔ ابو عوانہ الاسفرائنی۔ (صحیح ابی عوانہ: ۲/ ۴۲، ح: ۵۸۵۹) ۲: حاکم۔ (المستدرک: ۴/ ۴۳۳، ح: ۸۳۳۲) ۳: ذہبی۔ (ایضاً، ح: ۸۳۳۲) ان کے مقابلے میں کسی ایک محدث یا امام نے اس حدیث کو ضعیف نہیں کہا، لہٰذا اِس روایت کے صحیح اور مقبول ہونے پر اجماع ہے۔''

(تحقیقی مقالات: ۳/ ۳۵۰)

یعنی ان کے نزدیک جس حدیث کی صحت تین ائمہ سے ثابت ہو جائے اور ان کا کوئی مخالف نہ ہو تو اس پر اجماع ہوگا۔ شیخ موصوف سے قبل کسی محدث نے اس حدیث کی صحت پر اجماع کا دعویٰ نہیں کیا۔

انصاف فرمائیے! العلل الکبیر کو اکتالیس محدثین و علمائے کرام نے امام ترمذی کی طرف منسوب کیا ہے اور کسی نے انکار بھی نہیں کیا، کیا ان کا اجماع نہیں اور ان کا اجماع معتبر نہیں؟ کیا سبھی علماء کی نگاہوں سے وہ نکتہ اوجھل رہا جس کی نشان دہی شیخ مکرم نے کی؟

③..... نیز لکھتے ہیں:

''آج تک کسی مسلم عالم نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ اہل الحدیث سے مراد محدثین کی جماعت ہے، لہٰذا اِس صفاتی نام اور نسب کے جائز ہونے پر اجماع ہے۔''

(اہل حدیث ایک صفاتی نام، ص: ۵۸)

④..... ''امام دارقطنی کے اس قول سے معلوم ہوا کہ ولید بن مسلم تدلیس تسویہ کرتے تھے۔ ولید بن مسلم کو حافظ ابن حجر، العلائی، ابوزرعہ ابن العراقی، ذہبی، حلبی، مقدسی اور سیوطی وغیرہم نے مدلس قرار دیا ہے۔ (دیکھیے: الفتح المبین، ص: ۷۳) اور ان کا کوئی مخالف مجھے معلوم نہیں، لہٰذا تدلیسِ ولید پر اجماع ہے۔'' (أضواء المصابیح في تحقیق مشکاة المصابیح: ۱/ ۲۷۸)

حالانکہ شیخ سے قبل کسی نے بھی تدلیسِ ولید پر اجماع کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ اس اجماع کا ذکر مدلسین سے مختص کتاب الفتح المبین في تحقیق طبقات المدلسین (ص: ۱۳۶) میں بھی نہیں کیا۔

ثانیاً: حافظ ابن حجر، العلائی، ابوزرعہ ابن العراقی، ذہبی اور سیوطی وغیرہم نے بھی العلل الکبیر کو امام ترمذی کی طرف منسوب کیا ہے

جس کی تفصیل ہم اپنے پہلے مقالے میں عرض کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ہفت روزہ الاعتصام، لاہور، جلد: ۶۷، شمارہ: ۲۵، ص: ۱۸-۲۱)

اگر ان ائمہ کے اقوال کی بنیاد پر تدلیسِ ولید پر اجماع کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے تو العلل الکبیر پر کیوں نہیں!

⑤...... ''محدثین نے (سفیان) ثوری کی تدلیس پر اجماع کیا ہے...... یہ روایت منکر مردود اور اجماع کے مخالف ہے۔''
(الفتح المبین، ص: ۶۸، مطبوعہ ۱۴۳۴ھ)

⑥...... ''ترکِ رفع یدین والی روایتِ مذکورہ میں ایک راوی امام سفیان ثوری ہیں جو کہ بالا جماع مدلس تھے۔''
(تحقیقی مقالات: ۴/۲۰۵)

⑦...... ''یاد رہے کہ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کا مدلس ہونا اجماع اور تواتر سے ثابت ہے اور اس کا انکار جہالت ہے۔''
(تحقیقی مقالات: ۴/۲۱۴)

⑧...... ''یہاں تو سفیان ثوری کے مدلس ہونے پر اجماع ہے۔'' (تحقیقی مقالات: ۴/۲۳۶)

⑨...... ''عرض یہ کہ سفیان ثوری کا مدلس ہونا اجماعی مسئلہ ہے۔'' (فتاویٰ علمیہ المعروف توضیح الاحکام: ۲/۳۱۳)

حالانکہ موصوف محترم سے قبل کسی نے ثوری کے مدلس ہونے پر اجماع کا دعویٰ نہیں کیا۔

⑩...... ''میرے علم کے مطابق کسی نے بھی محمد بن اسحاق کی تدلیس کا انکار نہیں کیا، گویا اس کی تدلیس بالا جماع ثابت شدہ ہے۔'' (تحقیقی مقالات: ۱/۲۷۳)

ابن اسحاق کی تدلیس پر کسی معتبر محدث نے اجماع نقل نہیں کیا۔ اگر ہم بھی محدثین کے اقوال کی روشنی میں اس کتاب کی صحت پر اجماع کا دعویٰ کریں تو وہ غلط کیوں کر قرار پائے!

ثانیاً: اگر کتاب کی سند ضعیف ہی ہو تو کیا علماء کا اجماع اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور کتاب قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتی؟

شیخ مکرم ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''امام ابو حاتم الرازی: اسماء الرجال کے مشہور امام ابو حاتم الرازی فرماتے ہیں:

"و اتفاق أهل الحديث على شيء يكون حجة."

''اور کسی چیز پر اہلِ حدیث کا اتفاق حجت ہوتا ہے۔''
(کتاب المراسیل، ص: ۱۹۲، فقرہ: ۷۰۳)''
(تحقیقی مقالات: ۱/۱۶۴، ۱۶۵)

اہلِ حدیث کا العلل الکبیر پر اتفاق حجت کیوں نہیں؟

## ۲۔ غنیۃ الطالبین میں اُصول شکنی:

غنیۃ الطالبین شیخ عبدالقادر جیلانی کی نہایت معروف تصنیف ہے جس کی بابت شیخ نے استفسار کیا گیا:

''سوال: کیا غنیۃ الطالبین نامی کتاب شیخ عبدالقادر جیلانی سے ثابت شدہ ہے؟...... الخ۔

الجواب: غنیۃ الطالبین کتاب کے بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے لیکن حافظ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) اور ابن رجب الحنبلی (متوفی ۷۹۵ھ) دونوں اسے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی کتاب قرار دیتے ہیں۔ (دیکھیے کتاب العلو للعلي الغفار للذهبي، ص: ۱۹۳، الذیل علی طبقات الحنابلۃ لابن رجب: ۱/۲۹۶) اور یہی راجح ہے۔

تنبیہ: مروجہ غنیۃ الطالبین کے نسخے کی صحیح و متصل سند میرے علم میں نہیں ہے، واللہ اعلم۔'' (فتاویٰ علمیہ: ۲/۴۲۱)

اس جواب پر درج ذیل ملاحظات ہیں:

❶...... مولانا موصوف ''قلمی اور مطبوعہ کتابوں سے استدلال کی شرائط'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''شرط نمبر ۲: کتاب کے مخطوطے کا ناسخ و کاتب ثقہ وصدوق

ہو۔ شرط نمبر۳: ناسخِ مخطوطہ سے صاحبِ کتاب تک سند صحیح ہو...... ان شرائط میں سے اگر ایک شرط بھی موجود نہ ہو تو اس کتاب کی روایت سے استدلال کرنا باطل و مردود ہو جاتا ہے۔'' (مقدمہ جعلی جزء کی کہانی، ص:۱۵، ۱۶)

عرض ہے کہ غنیۃ الطالبین میں کم از کم یہ دونوں شروط ختم ہو گئیں، لہٰذا اِس سے استدلال ''باطل و مردود'' ہو گیا تو پھر کیوں استدلال کیا گیا؟

❷...... اگر نسخے کی صحیح و متصل سند موجود نہیں تو پھر متداول نسخے کو شیخ جیلانی کی کتاب قرار دینا کہاں کا انصاف ہے؟

❸...... اُنھوں نے اس کی نسبت کے لیے دو محدثین کے نام پیش کیے: ۱۔ حافظ ذہبی، ۲۔ حافظ ابن رجب۔

اس طالبِ علم کا نہایت آسان سوال ہے کہ اگر غنیۃ الطالبین دو محدثین کی صراحت سے شیخ جیلانی کی تصنیف قرار دی جا سکتی ہے تو العلل الکبیر اکتالیس محدثین کی وضاحت کے بعد کیوں نہیں؟

❹...... اُنھوں نے غنیۃ الطالبین کے بارے میں علماء کے اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سوال ہے کہ مختلف فیہ کتاب میں دو محدثین کا قول فیصلہ کن ثابت ہو سکتا ہے تو العلل الکبیر، جس کی نسبت میں کسی کا کوئی اختلاف ہی نہیں، میں کیوں نہیں ہو سکتا؟

❺...... حافظ ذہبی اور حافظ ابن رجب کے اقوال کی بنیاد پر غنیۃ الطالبین شیخ جیلانی کی کتاب ہو سکتی ہے تو انھی کے اقوال پر العلل الکبیر امام ترمذی کی کیوں نہیں ہو سکتی؟

ہم ہفت روزہ الاعتصام، لاہور (جلد: ۶۷، شمار: ۲۵، ص: ۱۸-۲۰) میں ان دونوں ائمہ کے متعدد اقوال نقل کر چکے ہیں۔

## غنیۃ الطالبین سے استدلال:

①...... فضیلۃ الشیخ مولانا زبیر علی زئی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

''شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا:

''ولا یجوز وصفه بأنه في كل مكان، بل يقال: إنه في السماء على العرش.''

''یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ (اللہ) ہر جگہ میں ہے، بلکہ یہ کہا جاتا ہے: وہ آسمان میں عرش پر ہے۔'' (الغنية لطالبي طريق الحق: ۱/ ۵۶، العلو للعلي الغفار: ۲/ ۱۳۷۰، فقرة: ۵۴۸، ذيل طبقات الحنابلة لابن رجب: ۱/ ۲۹۶)

یاد رہے کہ غنیۃ الطالبین عبدالقادر جیلانی کی کتاب ہے۔ (دیکھیے کتاب الذیل علی طبقات الحنابلہ لابن رجب: ۱/ ۲۹۶ والعلو للعلی الغفار: ۲/ ۱۳۷۰)''

(فتاویٰ علمیہ: ۳/ ۲/ ۷۷، ۳۷، مطبوعہ ۲۰۱۵ء)

②...... ''(۲۰) مشہور واعظ شیخ عبدالقادر بن ابی صالح الجیلانی الحسنی الحنبلی (متوفی ۵۶۱ھ) نے قرآن کو مخلوق یا ''لفظي بالقرآن مخلوق'' کہنے والے بدعتی کے بارے میں فرمایا: ''ولا يصلى خلفه.'' (اور اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیے)۔'' (الغنية لطالبي طريق الحق: ۱/ ۵۸، غنیۃ الطالبین، ترجمہ محبوب احمد: ۱/ ۱۰۴، غنیۃ الطالبین، ترجمہ عبدالدائم جلالی، ص: ۱۰۰)''

(بدعتی کے پیچھے نماز کا حکم، ص: ۸۵)

اس وقت ہم مولانا موصوف کا وہ اصول دہرانا چاہتے ہیں جو اُنھوں نے صحتِ کتاب کے حوالے سے ذکر کیا ہے:

''کسی کتاب سے حوالہ پیش کرنے کے لیے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے: اول: صاحبِ کتاب ثقہ و صدوق ہو۔ دوم: کتاب، صاحبِ کتاب تک صحیح ثابت ہو۔ سوم: صاحبِ کتاب سے لے کر صاحبِ قول و روایت تک سند صحیح و حسن لذاتہ ہو۔ ان شرطوں میں سے اگر ایک بھی مفقود ہو تو پھر کتاب کا حوالہ بے کار اور مردود ہو جاتا ہے۔''

(فتاویٰ علمیہ: ۲/ ۴۱۴)

عرض ہے کہ کیا غنیۃ الطالبین میں شرطِ دوم ختم نہیں ہوجاتی۔ اور اس کے بعد کیا اس کا حوالہ ''بے کار اور مردود'' ہے؟ اگر ایسی ہی صورت ہے تو پھر پیش کرنے کا کیا فائدہ؟ کیا یہ اُصول شکنی نہیں؟ حالانکہ وہ خود لکھتے ہیں:

''اپنے ہی اُصول توڑ کر پاش پاش کر دینا مذہبی خودکشی کی بدترین مثال ہے۔'' (فتاویٰ علمیہ: ۳/ ۲۵۶)

مزید رقم طراز ہیں:

''بے سند کتابوں کے جتنے بھی حوالے ہوں، تحقیقی میدان میں مردود ہوتے ہیں۔'' (تحقیقی مقالات: ۳/ ۳۸۲)

بلکہ اُنھوں نے ایک مضمون بہ عنوان ''بے سند اقوال سے استدلال غلط ہے'' بھی لکھا۔ (دیکھیے تحقیقی مقالات: ۳/ ۲۱۵-۲۱۷، ماہنامہ الحدیث، حضرو، شمارہ: ۶۹، ص: ۲۔ فروری ۲۰۱۰ء)

مولانا کے ان اقوال پر تبصرہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

## ۳۔ تاریخ الغرباء مفقود ہے:

امام ابو سعید عبدالرحمان بن احمد بن یونس بن عبدالاعلیٰ الصدفی المصری (وفات: ۳۴۷ھ)، جو امام ابن یونس مصری کے نام سے معروف ہیں، کی دو کتب شہرۂ آفاق ہیں: ۱: تاریخ المصریین، ۲: تاریخ الغرباء. ان دونوں کا شمار گم شدہ (مفقود) کتابوں میں ہوتا ہے۔

❶ ......مولانا مرحوم نے مکحول شامی کی توثیق میں پانچویں موثق امام ابن یونس مصری کو ذکر کیا ہے:

''(۵) ابو سعید ابن یونس المصری (متوفی ۳۴۷ھ) نے کہا: ''وکان فقیھا عالما'' (اور آپ فقیہ عالم تھے)۔'' (تاریخ الغرباء، یعنی تاریخ ابن یونس: ۲/ ۲۳۶، رقم: ۶۳۱)'' (تحقیقی مقالات: ۴/ ۳۵۵، ماہنامہ الحدیث، شمار: ۷۹، ص: ۴۴۔ دسمبر ۲۰۱۰ء)

اُنھوں نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے، حوالہ پیش کرنے سے قبل اس کتاب کو اپنے اُصول کے مطابق پرکھنا چاہیے تھا۔ اگر وہ ان کی مقرر کردہ کسوٹی پر پوری اترتی تو اسے حوالے کے لیے پیش کرتے، ورنہ اپنے مخصوص الفاظ اور اندازِ بیان میں اس کی بھرپور تردید کرتے۔

مگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ دو جلدوں میں مطبوع کتاب امام ابن یونس مصری کی ذاتی تصنیف ہے ہی نہیں، بلکہ ڈاکٹر عبدالفتاح فتحی عبدالفتاح کی کاوش ہے جس میں اُنھوں نے مختلف مصادرِ رجال وغیرہ سے ان راویان کو اکٹھا کیا جن پر امام صاحب نے توثیقاً یا تجریحاً کلام کیا، پھر ان کی تحقیق کی اور کتاب کا دراسہ کیا۔ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مختلف فہارس کا اہتمام کیا اور کتاب کے سرِورق پر لکھا:

القسم الثاني: تاريخ الغرباء

جمع و تحقيق ودراسة وفهرسة:

الدكتور عبدالفتاح فتحي عبدالفتاح

دوسری جلد کے آخر میں لکھا:

"تم -بحمد الله تعالى -تجميع ما تيسر لي من بقايا كتاب "تاريخ الغرباء" للمؤرخ المصري ابن يونس الصدفي."

(تاريخ ابن يونس المصري: ۲/ ۲٦۳)

تاریخ الغرباء کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''ابن یونس نے یہ کتاب ''تاریخ الغرباء'' تالیف کی، وہ بھی تاریخ المصریین کی طرح گم شدہ ہے۔ یہ پچھلی کتاب سے ضخامت اور تراجم میں مختلف ہے۔'' (مقدمہ جمع و تحقیق: ۲/ ۳)

ازاں بعد جمع و ترتیب کے بارے میں اپنے منہج کی وضاحت کی۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''گیارہویں صدی ہجری کے وسط تک یہ دونوں کتب موجود تھیں، پھر گم ہوگئیں۔'' (تاریخ الغرباء: ۲/ ۳۱۸)

اُنھوں نے اس کتاب کی جلد اول میں تاریخ المصریین کے

راوی جمع کیے ہیں جن کی تعداد ۱۴۶۲ ہے۔ اور تاریخ الغرباء میں ۷۰۳ رواۃِ مصر جمع کیے ہیں۔ کل راوی ۲۱۶۵ ہوئے۔

اس لیے مولانا کا تاریخ الغرباء کو امام ابن یونس کی تصنیف قرار دینا درست نہیں۔

❷ ......اسی پر بس نہیں، وہ ایک اور راوی (عثمان بن الحکم الجذامی المصری) کی توثیق کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ابن یونس (مورّخِ مصر) نے کہا کہ وہ فقیہ اور متدین تھا۔ ایضاً''

(نور العینین، ص: ۳۵، مطبوعہ اکتوبر ۲۰۱۲ء)

''ایضاً'' سے مراد تہذیب التہذیب از ابن حجر ہے۔ حالانکہ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب (۷/۱۱۱) میں امام ابن یونس مصری کا یہ قول بدون نسبتِ کتاب ذکر کیا ہے اور اس قول کی کوئی سند بھی بیان نہیں کی، اس کے باوجود شیخ کا ایسے قول سے استدلال کرنا نہایت عجیب ہے۔

اولاً: آپ مولانا کا قول ابھی پڑھ آئے ہیں کہ صاحبِ کتاب سے لے کر صاحبِ قول و روایت تک سند صحیح و حسن لذاتہ ہو۔ (ورنہ) کتاب کا حوالہ بے کار اور مردود ہو جاتا ہے۔ (فتاویٰ علمیہ: ۲/۴۱۴)

ثانیاً: مولانا دو مقامات پر رقم طراز ہیں:

''جس شخص کا جو قول بھی پیش کیا جائے اس کا صحیح و ثابت ہونا ضروری ہے۔ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ یہ فلاں کتاب، مثلاً: تہذیب الکمال، میزان الاعتدال یا تہذیب التہذیب وغیرہ میں لکھا ہوا ہے۔ بلکہ اس کے ثبوت کے بعد ہی اسے بہ طورِ جزم پیش کرنا چاہیے۔'' (ماہنامہ الحدیث، شمارہ: ۳۴، ص: ۳۔ مارچ ۲۰۰۷ء، مقدمہ تحقیق موطأ، ص: ۵۵)

یوں شیخ نے خود ہی اپنے اس اصول کی مخالفت کر دی۔

ملحوظ رہے کہ عثمان الجذامی کا ترجمہ تاریخ المصریین لابن یونس میں موجود ہے۔ (تاریخ ابن یونس المصری (جمع: عبدالفتاح): ۱/۳۳۷، ۳۳۸ ترجمہ: ۹۲۲)

❸ ......مولانا مرحوم امام مکحول کی توثیق میں لکھتے ہیں:

''امام ابن یونس مصری فرماتے ہیں:

''اتفقوا علی توثیقه.'' (مکحول کے ثقہ ہونے پر اتفاق ہے)۔ (تهذيب الأسماء و اللغات للنووي: ۲/ ۱۱۴)'' (الكواكب الدرية في وجوب الفاتحة خلف الإمام في الصلاة الجهرية: مسئلہ فاتحہ خلف الامام، ص: ۶۱، مطبوعہ جون ۲۰۰۷ء)

حالانکہ امام نووی نے اسے امام ابن یونس مصری کی کتاب سے نقل کرنے کی صراحت نہیں کی، نہ ان تک کوئی سند بیان کی اور نہ ہی تهذيب الأسماء واللغات امام ابن یونس کی کتاب ہے۔

یہ حوالہ بھی مولانا کا اپنے ہی اُصول سے رُوگردانی کا نمونہ ہے۔

مکحول کا ترجمہ تاریخ ابن یونس- تاریخ الغرباء- میں موجود ہے۔ (۲/۲۳۶، ۲۳۷، ترجمہ: ۱۳۱۶۔ جمع و تحقیق: عبدالفتاح)

ڈاکٹر صاحب موصوف نے امام ابن یونس مصری کا مذکورہ بالا قول نقل نہیں کیا جو انھیں ذکر کرنا چاہیے تھا۔

مولانا نے امام ابن یونس مصری کے چوتھے قول، جو امام نسائی کی فلسطین میں وفات کے بارے میں تھا، کا یوں حوالہ دیا:

''سير أعلام النبلاء: ۱۴/ ۱۳۳، المستفاد من ذيل تاريخ بغداد: ۱۹/ ۴۹، تاريخ ابن يونس المصري: ۲/ ۲۴، ت: ۵۵.''

(تحقیقی مقالات: ۶/۲۷۴)

نفسِ مسئلہ اور ذکر کردہ اُصول سے قطع نظر ان حوالوں کی تفصیل یہ ہے کہ حافظ ذہبی نے ''قال أبو سعيد ابن يونس في تاريخه'' لکھا ہے۔ (سیر: ۱۴/ ۱۳۳) یہاں سوال یہ ہے کہ امام ذہبی اگر سیر أعلام النبلاء سے تاریخ ابن یونس کا حوالہ نقل کریں تو وہ مستند اور جب کہیں: ''وقال الترمذي في علله.'' (سیر أعلام النبلاء: ۶/۱۴۱) تو وہ کیوں غیر معتبر

ٹھہرے؟

ہم حافظ ذہبی کے متعدد اقوال ہفت روزہ الاعتصام، لاہور (جلد: ۶۷، شمارہ: ۲۵، ص: ۱۸) میں ذکر کر چکے ہیں جس کا کوئی جواب مولانا ندیم صاحب نہ دے سکے!

رہا مولانا مرحوم کا ذکر کردہ دوسرا حوالہ تو وہ حافظ دمیاطی نے بدون نسبتِ کتاب ہی ذکر کیا ہے اور اپنی سند بھی بیان نہیں کی۔

تیسرا حوالہ تاریخ ابن یونس المصری کا ہے جو عبدالفتاح فتحی کی جمع کردہ کتاب ہے، امام ابن یونس کی نہیں۔ ان کا مرجع بھی المستفاد من ذیل تاریخ بغداد ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مولانا نے مکحول شامی کی توثیق کے بارے میں دو اقوال اور عثمان الجذامی کے بارے میں ایک قول امام ابن یونس مصری سے نقل کیا ہے جو ان کے قائم کردہ معیارِ صحت پر پورے نہیں اترتے۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ حافظ ابن حجر اور امام نووی نے امام ابن یونس مصری کی کسی کتاب سے نقل کیے ہوں گے، لہٰذا اُن کے معتبر ہونے میں کیا شبہ ہے؟

عرض ہے کہ شیخ کے اُصول کے مطابق ناقل کا بالصراحت حوالہ دینا ضروری ہے کہ اس نے کس کتاب سے یہ قول اخذ کیا ہے۔ ہمارے نزدیک ایسے حوالے معتبر ہوتے ہیں، سوائے ان حوالوں کے جن کی تغلیط کے دیگر اسباب موجود ہوں۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ صاحبِ کتاب سے لے کر صاحبِ قول تک متصل سند کا اُنھوں نے خود کس قدر پاس کیا ہے، سرِدست دو مثالیں پیش خدمت ہیں۔

①...... اُنھوں نے ''ائمہ مسلمین اور رفع الیدین'' کے جلی حروف کے تحت امام اوزاعی کا نام بھی ذکر کیا ہے:

''(۶): امام اوزاعی۔ (التمہید: ۹/ ۲۲۶)۔''

(نور العینین، ص: ۳۲۱)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''الطبري بہ حوالہ التمهيد (۹/ ۲۲۶) و سند الطبري صحيح.'' (نور العینین، ص: ۱۸۰)

یعنی امام اوزاعی بھی مثبّتین رفع الیدین میں شامل ہیں، حالانکہ حافظ ابن عبدالبر (وفات: ۴۶۳ھ) نے اپنی کتاب التمہید میں امام اوزاعی کا قول امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری (وفات: ۳۱۰ھ) سے نقل کیا ہے۔ یہ قول منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے کیوں کہ امام طبری کی وفات اور حافظ ابن عبدالبر کی پیدائش کے مابین اٹھاون (۵۸) برس کا فاصلہ ہے! اب وہ اُصول کہاں گیا کہ صاحبِ کتاب سے لے کر صاحبِ قول تک سند متصل ہونی چاہیے!

②...... اسی فہرست میں اُنھوں نے ابوالولید ہشام بن عبدالملک الطیالسی کا بھی ذکر کیا ہے:

''(۱۰) ابوالولید الطیالسی۔ (المعجم لابن الأعرابي: ۲/ ۴۱۰، ۴۱۱)'' (نور العینین، ص: ۳۲۱)

یہ سند بھی راوی کے عدمِ ترجمہ کی وجہ سے ضعیف ہے کیوں کہ المعجم لابن الاعرابی (۲/ ۴۱۰، ۴۱۱، رقم: ۱۲۵۷۔ دوسرا نسخہ: ۲/ ۶۳۳، ۶۳۴، رقم: ۱۲۵۷) میں امام ابن الاعرابی کے استاد تمیم بن عبداللہ ابومحمد الرازی کا ترجمہ نہیں مل سکا۔

سوال یہ ہے کہ جب امام اوزاعی اور ابوولید طیالسی سے بہ سند صحیح اثباتِ رفع الیدین ثابت نہیں تو اس پر ''چھ'' اور ''دس'' نمبر کیوں لگایا؟ کیوں کہ وہ لکھتے ہیں:

''چونکہ یہ توثیق باسند صحیح ثابت نہیں، لہٰذا میں نے اس پر کوئی نمبر نہیں لگایا۔'' (تحقیقی مقالات: ۶/ ۱۴۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''یہ روایت المروزی کے عدمِ تعین کی وجہ سے ثابت نہیں، لہٰذا اِس پر یہاں کوئی نمبر نہیں لگایا گیا۔''

(تحقیقی مقالات: ۶/ ۱۶۰)

## ۴۔کتاب الصلاۃ لابن حبان:

بعض الناس نے کتاب الصلاۃ لابن حبان کا انکار کیا تو شیخِ مکرم نے جواب دیا:

''عرض ہے کہ حافظ ابن حبان کی کتاب الصلاۃ (صفة الصلاة، وصف الصلاة بالسنة) کا ذکر درج ذیل کتابوں میں موجود ہے:

البدر المنير لا بن الملقن، طرح التثريب في شرح التقريب لأبي زرعة ابن العراقي، تهذيب السنن لابن القيم، اتحاف المهرة لابن حجر العسقلاني، التلخيص الحبير، معجم البلدان لياقوت الحموي، مغني المحتاج للشربيني.

بلکہ حافظ ابن حبان نے اپنی صحیح ابن حبان میں اپنی کتاب صفة الصلاة کا علیحدہ ذکر کیا ہے۔(دیکھیے الاحسان: ۱۸۴/۵، رقم: ۱۸۶۷۔ دوسرا نسخہ، رقم: ۱۸۶۴)۔''

(نور العینین، ص: ۴۱۶)

یعنی اُنھوں نے ایک گم شدہ کتاب کے اثبات کے لیے محدثین وغیرہ کے حوالے پیش کیے اور ازاں بعد حافظ ابن حبان کا قول پیش کیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر محدثین کی نقل سے یا کتاب کے محض ذکر سے گم شدہ کتاب ثابت ہو جاتی ہے تو العلل الکبیر کیوں ثابت نہیں ہو سکتی؟

مولانا مرحوم نے حافظ ابن حبان کی کتاب الصلاۃ سے قول بہ حوالہ التلخیص الحبیر اور البدر المنیر لابن الملقن نقل کیا ہے۔ (نور العینین، ص: ۱۳۱)

اس پر مزید گفتگو آئندہ آئے گی، ان شاء اللہ۔

## ۵۔الضعفاء للبخاري کی استنادی حیثیت:

الضعفاء الصغیر امام بخاری کی معروف کتاب ہے جس کی تحقیق شیخِ مکرم نے ''تحفة الأقوياء في تحقيق كتاب الضعفاء'' کے نام سے کی ہے۔ ان کے اُصول کے مطابق اس کتاب کی بھی امام بخاری کی طرف نسبت مشکوک قرار پاتی ہے۔ وہ سندِ کتاب کے ایک راوی ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عبداللہ بن الحسین الفارانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''لم أجد له ترجمة. ولم ينفرد بأصل الكتاب ونصوصه كما يظهر من تحقيق هذا الكتاب. ودراسة هذا الكتاب يدل على أنه صدوق.'' (مقدمة تحفة الأقوياء، ص: ۷)

''مجھے اس راوی کا ترجمہ نہیں ملا۔ وہ اصل کتاب اور اس کی نصوص بیان کرنے میں منفرد نہیں، جیسے اس کتاب کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کتاب کا دراسہ اس کے صدوق ہونے پر دلالت کرتا ہے۔''

لیجیے جناب! راویِ کتاب کا ترجمہ موجود نہیں اور موصوف قرائن کی طرف چل دیے کہ وہ اصل کتاب اور اس کی نصوص بیان کرنے میں منفرد نہیں۔ حالانکہ انھیں اپنے ''اُصول'' کی پیروی میں ضعیف سند والی کتاب کی تحقیق ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یا ایسا نسخہ ڈھونڈنا چاہیے تھا جو کاتبِ نسخہ سے لے کر امام بخاری تک صحیح اور متصل سند سے موجود ہوتا، جیسا کہ اُنھوں نے المعجم المفهرس لابن حجر (ص: ۲۳۵، کتاب: ۶۷۶) میں مذکور دوسری سند کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (مقدمہ تحقیق تحفۃ الاقویاء، ص: ۸)

## ۶۔ابو حامد التاجر کی ''غیر صریح توثیق'':

مولانا مرحوم رقم طراز ہیں:

''اب محمود بن اسحاق رحمہ اللہ کی صریح اور غیر صریح توثیق کے دس سے زیادہ حوالے پیش خدمت ہیں:

۱: حافظ ابن حجر العسقلانی نے محمود بن اسحاق کی بیان کردہ ایک روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ (دیکھیے موافقة الخبر

الخبر في تخريج أحاديث المختصر:۱/ ۴۱۷)
تنبیہ: راوی کی منفرد روایت کو حسن یا صحیح کہنا، اس راوی کی توثیق ہوتی ہے۔(دیکھیے نصب الرایہ:۱/ ۱۴۹، ۳/ ۲۶۴)
۲: علامہ نووی نے جزء رفع الیدین سے ایک روایت بہ طورِ جزم نقل کی اور فرمایا: ''بإسناده الصحيح عن نافع .'' (المجموع شرح المہذب:۳/ ۴۰۵)
معلوم ہوا کہ نووی جزء رفع الیدین کو امام بخاری کی صحیح وثابت کتاب سمجھتے تھے۔
۳: ابن الملقن (صوفی) نے جزء رفع الیدین سے ایک روایت بہ طور جزم نقل کی اور فرمایا: ''بإسناد صحيح عن نافع عن ابن عمر .'' (البدر المنیر:۳/ ۴۷۸)
۴: زیلعی حنفی نے جزء رفع الیدین سے روایات بہ طورِ جزم نقل کیں۔(دیکھیے نصب الرایہ:۱/ ۳۹۰، ۳۹۳، ۳۹۵)
۵: مشہور محدث ابوبکر البیہقی رحمہ اللہ نے محمود بن اسحاق کی روایت کردہ کتاب جزء القراءة للبخاري کو بہ طورِ جزم امام بخاری سے نقل کیا ہے۔(مثلاً: دیکھیے کتاب القراءة خلف الإمام للبيهقي ،ص:۲۳، ح:۲۸)
۶: علامہ ابوالحجاج المزی رحمہ اللہ نے جزء القراءة کو بہ طورِ جزم امام بخاری سے نقل کیا ہے۔(مثلاً: دیکھیے تہذیب الکمال: ۳/ ۱۷۲، ترجمہ: سعید بن سنان البرجمی)
۷: عینی حنفی نے جزء رفع الیدین کو امام بخاری سے بہ طورِ جزم نقل کیا ہے۔(دیکھیے عمدۃ القاری ۵/ ۲۷۲، تحت رقم: ۷۳۵، نیز دیکھیے شرح سنن ابی داود للعینی: ۳/ ۲۵۰، ح: ۷۳۲ اور معانی الاخبار: ۳/ ۴۷۶)
۸: بدرالدین محمد بن بہادر بن عبداللہ الزرکشی نے جزء مذکور کو بہ طورِ جزم نقل کیا ہے۔(دیکھیے البحر المحیط في أصول الفقه:۴/ ۴۴۹ مکتبہ شاملہ)
۹: محمد الزرقانی نے جزء رفع الیدین کو امام بخاری سے بہ طورِ جزم نقل کیا ہے۔(دیکھیے شرح الزرقانی علی الموطأ: ۱/ ۱۵۸، تحت رقم: ۲۰۴، باب ماجاء فی افتتاح الصلاۃ)
۱۰: سیوطی نے فض الوعاء میں جزء رفع الیدین کو بہ طورِ جزم امام بخاری سے نقل کیا۔(دیکھیے فض الوعاء فی احادیث رفع الیدین بالدعاء:۱/ ۵۹، قبل ح:۱۸)
۱۱: ذہبی۔(التنقيح لكتاب التحقيق لأحاديث التعليق:۱/ ۲۴۹، ط. مکتبہ نزار مصطفی الباز، مکہ)
۱۲: مغلطائی حنفی۔(دیکھیے شرح سنن ابن ماجہ لمغلطائی: ۱/ ۱۴۱۴، ۱۴۶۶، ۲/ ۸ شاملہ)
وغیر ذلک، مثلاً: دیکھیے تنقیح التحقیق (۲/ ۲۱۸، ح: ۷۵۸، ۱/ ۳۷۸ شاملہ)
آلِ دیوبند و آلِ بریلی اور آلِ تقلید کے کئی علماء نے جزء رفع اليدين اور جزء القراءة (كلاهما للبخاري / دونوں یا کسی ایک) کو بالجزم امام بخاری سے نقل کر رکھا ہے جن میں سے بعض حوالے درج ذیل ہیں۔''
(نور العینین ،ص:۵۲۶، ۵۲۷، مقالات:۵/ ۲۲۰، ۲۲۱)
ازاں بعد ان کے نام ذکر کیے، پھر لکھتے ہیں:
''ان سب نے جزء القراءة یا جزء رفع الیدین کے حوالے بہ طورِ جزم و بہ طورِ حجت نقل کیے ہیں۔اور بعض نے تو رفع الیدین سے مذکور ایک روایت کو صحیح سند قرار دیا ہے۔
ہمارے علم کے مطابق محمود بن اسحاق پر کسی محدث یا مستند عالم نے کوئی جرح نہیں کی اور ان کی بیان کردہ کتابوں اور روایتوں کو صحیح قرار دینا یا بالجزم ذکر کرنا (ان پر جرح نہ ہونے کی حالت میں) اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مذکورہ تمام علماء

وغیر علماء کے نزدیک ثقہ وصدوق تھے، لہٰذا جزء القراءۃ اور جزء رفع الیدین دونوں کتابیں امام بخاری سے ثابت ہیں۔"

(نور العینین ص:۵۲۸، مقالات:۵/۲۲۲)

نیز لکھتے ہیں:

"۸: ابن سید الناس الیعمری نے (جزء رفع الیدین سے) امام بخاری کے اقوال و روایات کو بہ طورِ جزم نقل کیا۔ (دیکھیے النفح الشذي شرح جامع الترمذی:۴/ ۳۹۸، ۳۹۹)

۹: ابن رجب حنبلی نے بھی امام بخاری کے کلام کو بہ طورِ جزم نقل کیا۔ (فتح الباری لابن رجب: ۴/۳۰۴، ۳۰۸ المکتبۃ الشاملۃ)

۱۰: غالی حنفی ملا علی قاری نے بھی جزء رفع الیدین سے امام بخاری کا کلام بہ طورِ جزم نقل کیا۔ (دیکھیے الأسرار المرفوعۃ ص:۲۷۴، فصل:۳۸)

......حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا محمود مذکور کی حدیث کو حسن کہنا اور مذکورہ وغیر مذکورہ علماء کا جزء رفع الیدین و کتاب القراءۃ کو بہ طورِ جزم ذکر کرنا تلقي بالقبول ہے۔"

(تحقیقی مقالات:۴/۴۵۳)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"چہارم: ہمارے علم کے مطابق کسی امام نے جزء رفع الیدین کے امام بخاری کی کتاب ہونے کا انکار نہیں کیا ......عبدالعزیز سے صدیوں پہلے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنے مسموعات میں کتاب رفع الیدین في الصلاۃ له (أي للبخاري) کو ذکر کیا ہے۔ (دیکھیے المعجم المفهرس ص:۶۱ فقرہ:۱۰۶)" (تحقیقی مقالات:۶/۹۴)

مولانا موصوف کے ذکر کردہ مذکورہ بالا اُصولوں کے تحت اگر کتاب القراءۃ یا جزء رفع الیدین ثابت ہو سکتے ہیں تو العلل الکبیر للترمذي کیوں نہیں ثابت نہیں ہو سکتی؟ آج تک کسی عالم یا محدث نے اس کا انکار نہیں کیا۔ محدثین نے بہ طورِ جزم العلل الکبیر سے کئی نصوص ذکر کی ہیں، بلکہ اسے تلقي بالقبول حاصل ہے۔ شیخِ مکرم سے "صدیوں پہلے حافظ ابن حجر نے اپنے مسموعات میں کتاب العلل للترمذي کو ذکر کیا ہے۔"

(المعجم المفهرس لابن حجر ص:۲۱۱، ۲۱۲، فقرہ:۵۸۴)

یہاں سوال یہ ہے کہ محدثین کی نقول سے ابو حامد التاجر (راوی کتاب العلل) کی "غیر صریح توثیق" کیوں ثابت نہیں ہو سکتی؟

اگر کوئی کہے کہ محمود بن اسحاق کی روایت کو حافظ ابن حجر نے حسن قرار دیا ہے اور ان سے ایک جماعت بھی روایت کرتی ہے، یہ وصف ابو حامد میں نہیں۔

عرض ہے کہ اگر یہ وصف ابو حامد میں ہوتا تو وہ محمود بن اسحاق جیسا ثقہ ہوتا، موجودہ صورت میں وہ محمود سے کم ثقہ ٹھہرا اور اس کی بیان کردہ کتاب بھی معتبر ہوئی! کیوں کہ شیخِ مکرم نے لکھا ہے کہ یہ شرط ضروری ہے کہ صاحبِ کتاب سے لے کر صاحبِ قول یا صاحبِ روایت تک سند صحیح یا حسن لذاتہ ہو۔ (باقی آئندہ)

❀❀❀

تحقیق وتنقید

قسط نمبر ②

# سندِ کتاب میں منہجی غلطی کا جائزہ

محمد خبیب احمد (ادارہ علوم اثریہ، فیصل آباد)

### ۷۔ اُصولِ دین از ابن ابی حاتم:

مولانا زبیر علی زئی رحمہ اللہ نے امام ابن ابی حاتم کی کتاب "أصل السنة و اعتقاد الدين" کا اردو ترجمہ بہ نام "اصولِ دین" پہلے ماہ نامہ الحدیث، حضرو (شمارہ:۲، ص:۴۱-۴۵۔ جولائی ۲۰۰۴ء) میں شائع کیا، پھر مقالات (۲/۱۷-۲۴) میں اسے شاملِ اشاعت کیا۔

اس کتاب کا پہلا راوی ابوزید الشامی ہے۔ ابوزید اُن کا لقب ہے، نام ونسب یوں ہے: جعفر بن زید بن جامع ابوالفضل الحموی۔ مولانا مرحوم نے ان کے بارے میں لکھا:

"السمعانی نے کہا: شيخ، صالح، خير، كثير العبادة. توفي ٥٥٤ هـ۔ (سير أعلام النبلاء: ۲۰/۳۴۱)۔"

(ماہ نامہ الحدیث، شمارہ:۲، ص:۴۱، مقالات: ۲/۱۷)

حافظ ذہبی نے انھیں الإمام الفاضل کہا ہے۔

(سير أعلام النبلاء: ۲۰/۳۴۰)

مولانا کے اس اقتباس پر دو ملاحظات ہیں:

①: حافظ ذہبی نے حافظ سمعانی کا کلام کہاں سے نقل کیا؟ اُنھوں نے کسی کتاب کے نام کی صراحت نہیں کی۔ اور نہ اپنی سند سے حافظ سمعانی کا کلام نقل کیا ہے۔ حافظ سمعانی عبدالکریم بن محمد ابوسعد ۵۶۲ھ میں فوت ہوئے جب کہ حافظ ذہبی ۶۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ (الدرر الكامنة لابن حجر: ۳/۴۲۶) گویا دونوں کے مابین ایک صد گیارہ (۱۱۱) برس کا فاصلہ ہے، لہٰذا یہ حوالہ غیر معتبر ہے۔

②: حافظ سمعانی کے (بلکہ حافظ ذہبی کے بھی) ذکر کردہ الفاظ راوی کی عدالت اور زہد وتقویٰ پر تو دلالت کرتے ہیں، ضبط پر نہیں۔

لہٰذا اس اعتبار سے شیخ کے اُصول کے مطابق وہ ثقہ وصدوق راوی نہ ہوا اور اس کی بیان کردہ کتاب بھی غیر ثابت ہوئی۔ (مقدمہ جعلی جزء کی کہانی، ص:۱۶) مگر اس کے باوجود دیکھیے کہ وہ کیا لکھتے ہیں:

"ابن ابی حاتم الرازی کی کتاب "اصول الدین" کی سند صاحبِ مخطوطہ سے لے کر ابن ابی حاتم تک صحیح ہے۔ (دیکھیے ماہ نامہ الحدیث، حضرو: جلد:۱، شمارہ:۲، ص:۴۱)"

(فتاویٰ علمیہ: ۱/۱۳۳، مقدمہ جعلی جزء کی کہانی (ترتیب: حافظ ندیم ظہیر)، ص:۱۵)

اس کمزوری کے باوجود اگر مذکورہ بالا رسالہ ثابت ہوسکتا ہے تو العلل الكبير کیوں ثابت نہیں ہوسکتی؟

**نوٹ:** ہمارے نزدیک ایسے طبقے کے رواۃ کے لیے اس قسم کے تعریفی کلمات استعمال کیے جاتے ہیں، اگر ان پر جرح موجود نہ ہو، ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہو، بالخصوص ان میں ان کے ہم زمانہ مشہور محدثین ہوں تو ان قرائن کے پیشِ نظر ان کی اسی قسم کی مدح سرائی کو ان کی ثقاہت پر محمول کیا جائے گا، بہ شرط کہ یہ تعریفی کلمات کہنے والے بھی کبار اہلِ علم ہوں۔

سندِ حدیث کے راویوں کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ ایسے راویوں کے لیے خال خال استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو ہمارے موقف کی تائید ہے کہ محدثین سبھی طبقات کے رواۃ کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کرتے۔ مزید تفصیل ابھی آرہی ہے۔

### ۸۔ العلل الكبير کی دوسری سند:

امام ترمذی سے اس کتاب کی دوسری سند بھی ہے۔ اس سند سے بھی حافظ ابن حجر نے العلل الكبير بیان کی ہے، چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

"أخبرنا أبو علي محمد بن أحمد الفاضلي- إجازة مشافهة- عن يونس بن أبي إسحاق عن عبدالرحمان بن مكي عن أبي القاسم بن بشكوال أنبأنا عبدالله بن أحمد بن سعيد بن يربوع- مناولة - عن أبي علي الجياني عن أبي القاسم حاتم بن محمد التميمي أنبأنا أحمد بن عباس بن أصبغ أنبأنا أبو يعقوب يوسف بن أحمد بن يوسف الصيدلاني أنبأنا أبو ذر محمد بن أحمد بن إبراهيم بن محمد الترمذي أنبأنا أبوعيسى الترمذي به." (تجريد أسانيد الكتب المشهورة و الأجزاء المنثورة (المعروف به) المعجم المفهرس لابن حجر العسقلاني، ص: ٢١١، ٢١٢، رقم: ٥٨٤)

اس سند کے راویان پر تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

①: امام ترمذی: صاحب السنن۔

②: ابوذر محمد بن احمد بن ابراہیم بن محمد الترمذی: ان کا ترجمہ نہیں مل سکا۔ اس سند میں موجود ان کی نسبت ترمذ شہر کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

③: ابویعقوب یوسف بن احمد بن یوسف الدخیل المکي الصيدلاني (وفات: ۳۸۸ھ): امام عقیلی سے الضعفاء الکبیر کے راوی ہیں۔ (مقدمۂ تحقیق الضعفاء الكبير: ۱/ ۴۰-۴۴) آپ مسندِ مکہ تھے۔ (تذكرة الحفاظ للذهبي: ۳/ ۱۰۲۰، تاریخ الاسلام از ذہبی، ص: ۱۷۸۔ حوادث: ۳۸۱ھ-۴۰۰ھ، الوافي بالوفيات للصفدي: ۲۹/ ۴۰، ترجمہ: ۴۴)

④: أحمد بن عباس بن أصبغ بن عبدالعزيز الهمداني يعرف بالحجاري القرطبي أبو العباس (وفات: ۴۱۹ھ): مکہ مکرمہ میں مستقل رہائش پذیر ہو گئے۔ آپ کا شمار مکہ کے بڑے شیوخ میں ہوتا تھا۔ (الصلة لابن بشکوال: ۱/ ۶۱، ۶۲، رقم: ۶۹، تاريخ الاسلام للذهبي، ص: ۴۵۸۔ حوادث: ۴۰۱ھ-۴۲۰ھ)

⑤: أبو القاسم حاتم بن محمد التميمي الطرابلسي الأندلسي القرطبي (وفات: ۴۶۹ھ): علامہ ابن بشکوال لکھتے ہیں: "وكان أحد المسندين الثقات."

امام ابوعلی الغسانی کہتے ہیں: "ثقة فيما يروي."

(الصلة لابن بشکوال: ۱/ ۱۸۴، ترجمہ: ۲۳۶)

امام ذہبی نے المحدث المتقن اور شیخ معمر محدث مسند قرار دیا ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۸/ ۳۳۶، تاریخ الاسلام، ص: ۲۸۳۔ حوادث: ۴۶۱ھ-۴۷۰ھ)

ابن قطلوبغا نے الثقات میں ذکر کیا ہے۔

(۳/ ۲۳۰، ترجمہ: ۲۴۶۰)

⑥: ابوعلی الجياني الغساني الحسین بن محمد الزہری القرطبی (وفات: ۴۹۸ھ): "الإمام الحافظ المجود الحجة الناقد محدث الأندلس...... كان من جهابذة الحفاظ." (سير أعلام النبلاء: ۱۹/ ۱۴۸)

مزید اقوال کے لیے ملاحظہ ہو مقدمۂ تحقیق تقييد المهمل للغساني (۱/ ۷۸-۸۱).

⑦: عبداللہ بن احمد بن سعید بن یربوع بن سلیمان ابو محمد الإشبيلي (وفات: ۵۲۲ھ): امام ابن بشکوال لکھتے ہیں:

"وہ حدیث اور اس کے علل کے حافظ تھے۔ اسماء الرجال اور راویانِ حدیث کو خوب جانتے تھے۔ ان میں سے معدّلین اور جارحین کو جانتے تھے۔ کتابت میں ضبط اور روایت میں ثقاہت تھی۔" (الصلة لابن بشکوال: ۱/ ۳۱۴، ترجمہ: ۶۰۷)

علامہ ابن الأبّار نے انھیں حافظ اور محقق کہا ہے۔ اور ان کی

کتب کی تعریف کی ہے۔(معجم شیوخ ابن الأبار الأندلسي، ص:۱۵۰، ترجمہ:۱۸۹)

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

"الأستاذ الحافظ المجود الحجة."

(سیر أعلام النبلاء: ۱۹/ ۵۷۸، تاریخ الإسلام، ص: ۷٦. حوادث: ۵۲۱ھ-۵٤۰ھ)

⑧: ابوالقاسم ابن بشکوال خلف بن عبدالملک بن مسعود القرطبی الانصاری (وفات:۵۷۸ھ):

"الإمام العالم الحافظ الناقد المجود محدث الأندلس."

(سیر أعلام النبلاء: ۲۱/ ۱۳۹)

⑨: عبدالرحمان بن مکی بن عبدالرحمان بن ابی سعید جمال الدین ابن الحاسب المغربي الإسکندراني السبط (وفات:٦۵۱ھ):

"الشيخ المسند المعمر وكان قليل العلم."

(سیر أعلام النبلاء: ۲۳/ ۲۷۸، ۲۷۹، تاریخ الإسلام، ص: ۹۷-۹۹. حوادث: ٦۵۱ھ-٦٦۰ھ)

⑩: یونس بن ابراہیم بن عبدالقوی الدبوسی (أو الدبابيسي) ابوالنون (وفات:۷۲۸ھ): آپ کبار ائمہ کے استاذ ہیں۔ حافظ برزالی اور علامہ سبکی نے انھیں معجم الشيوخ میں ذکر کیا ہے۔ (معجم الشيوخ للسبكي:۵۲۳، ۵۲٤، نیز ملاحظہ ہو: ذیل تاریخ الإسلام للذهبي، ص: ۳٤۳. حوادث: ۷۰۱ھ-۷۵۰ھ، الوافي بالوفيات للصفدي: ۲۹/ ۱۷۳، ۱۷٤، المنهل الصافي لابن تغري بردي: ۱۲/ ۲٦۰، ۲٦۱، الدرر الكامنة لابن حجر: ۵/ ۲۵۹، ۲٦۰، رقم: ۵۱۹۲)

⑪: ابوعلی محمد بن احمد الفاضل: محمد بن احمد بن النور المهدوي المعروف بابن المطرز (وفات:۷۹۷ھ):

(المجمع المؤسس للمعجم المفهرس لابن حجر: ۱/ ۳۷۵، رقم: ۲۱۷، إنباء الغمر لابن حجر: ۳/ ۲٦۹، شذرات الذهب: ٦/ ۳۵۰)

اس سند سے معلوم ہوا کہ امام ترمذی سے ابوحامد التاجر کے علاوہ ابوذر محمد بن احمد الترمذی بھی العلل الكبير کو روایت کرتے ہیں۔ امام ترمذی کے ان دونوں شاگردوں سے حافظ ابن حجر نے العلل کی سند ذکر کی ہے۔

آپ پڑھ آئے ہیں کہ شیخِ مکرم کے ''اصول'' کے مطابق ابوحامد التاجر کی ''غیر صریح توثیق'' ثابت ہو چکی ہے۔ ابوذر کی تائید بھی یقیناً اس کی صحت میں اضافہ کرتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ابوذر الترمذی (راوی العلل الكبير للترمذي) کا ترجمہ موجود نہیں۔ یوسف الدخیل ابو یعقوب، احمد بن عباس الحجازی، عبدالرحمان بن مکی، ابوعلی الفاضلی کی صراحتاً توثیق نہیں ملتی، لہٰذا یہ سند کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے؟

عرض ہے کہ جتنی احتیاط محدثین نے سندِ حدیث کے راویان کے لیے کی اتنی احتیاط سندِ کتاب کے راویان، سماعات میں مذکورین اور نازل ترین اسانید کے رواۃ کے لیے نہیں کی۔ راویانِ حدیث کا درجہ متعین کرنے کے لیے اُنھوں نے نہایت جان فشانی سے کام لیا۔ ثقہ، صدوق اور ضعیف رواۃ کو نہایت دقیق نظری سے تقسیم کیا۔ ثقہ کو أوثق الناس، ثقة ثقة، ثقة حافظ، ثقة متقن ثبت عدل جیسے اوصاف ذکر کر کے ان کے مراتب کی تعیین کی۔ صدوق راوی کو لابأس به، ليس به بأس، سيء الحفظ، صدوق يهم، له أوهام، يخطئ، تغير بآخره جیسی اصطلاحات میں منقسم کیا۔ اسی طرح ضعیف راوی پر مستور، مجهول الحال، متروك، واهي الحديث، ساقط، متهم بالكذب، كذاب، وضاع جیسے الفاظ سے جرح کی۔

تدوینِ حدیث کے بنیادی مآخذ مرتب ہونے کے بعد اُنھوں نے نرمی برتنی شروع کی۔ جتنی سند نازل ہوتی گئی، ان کے توثیقی اور تجریحی کلمات اسی قدر کم ہوتے گئے۔ اگر کوئی حدیث بنیادی مآخذ میں موجود ہے اور بعد والے محدثین نے بھی اسی حدیث کو اپنی نازل ترین سند سے روایت کیا ہے تو وہ بنیادی مآخذ پر حکم لگا کر متاخر طبقات کی کتب کو بدونِ نقد ہی ذکر کر دیتے ہیں کیوں کہ اصل حدیث تو ثابت ہو چکی ہے۔ آپ معاجم الشیوخ، مشیخات اور رجال پر مشتمل کتب میں ایسا دیکھ سکتے ہیں، حالانکہ ان کتابوں میں محدثین عموماً مشہور روایات ذکر کرتے ہیں، اس کے باوجود ان کے سبھی رواۃ کا ترجمہ نہیں مل سکے گا۔ اسی طرح تهذيب الكمال اور سير أعلام النبلاء میں جو روایات مصنفین نے اپنی سند سے بیان کی ہیں، ان کے تراجم کی بھی یہی صورت ہے۔ تاريخ دمشق کے رواۃ پر بھی تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ کتابوں کی سندوں کے حوالے سے چند معروضات آپ کے گوش گزار کی جا چکی ہیں، آئندہ بھی مزید آگاہی حاصل ہوگی، إن شاء الله.

جو شخص راویانِ حدیث کے بارے میں استعمال ہونے والے الفاظ، مشار الیہ رواۃ میں تلاش کرے گا یا ان کا تقاضا کرے گا، یقیناً وہ کئی مقامات پر ٹھوکریں کھائے گا۔

## ۹۔ الأدب المفرد للبخاري:

امام بخاری کی کتاب الأدب المفرد کا شمار ان کی مشہور ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ جسے ان کے شاگرد ابو الخیر احمد بن محمد بن الجليل بن خالد بن حريث البخاري الكرماني العبقسي البزار نے ۳۲۲ھ میں روایت کیا ہے۔

(مقدمہ الأدب المفرد، ص:۱۳)

یہ کتاب محدثِ زماں علامہ البانی کی تحقیق سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

ابو الخیر بھی مجہول راویوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان سے دو راوی روایت کرتے ہیں۔ محدثین نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ ابو الخیر امام بخاری سے الادب المفرد روایت کرتے ہیں، اس کے باوجود کسی نے ان کی توثیق نقل نہیں کی اور نہ الادب المفرد کو مشکوک نسبت والی کتاب قرار دیا۔ (الاکمال لابن ماکولا:۳/۱۷۹، تاریخ الاسلام للذهبي، ص:۱۰۱۔ حوادث و وفیات:۳۲۱ھ-۳۳۰ھ، المشتبه في الرجال للذهبي:۱/۲۶۸، تبصير المنتبه لابن حجر:۲/۵۳۶، هدي الساري، ص:۴۹۲، تغليق التعليق:۵/۴۳۶)

مولانا زبیر علی زئی سے صدیوں پہلے حافظ ابن حجر نے اپنی مسموعات میں الأدب المفرد للبخاري کو ذکر کیا ہے۔ (المعجم المفهرس لابن حجر، ص: ۱۰۵، رقم: ۲۳۲)

بلکہ مولانا مرحوم زندگی بھر اس کتاب سے استفادہ کرتے رہے۔ مذکورہ بالا راوی کی جہالت ان کے نزدیک اس کتاب کے غیر معتبر ہونے کا سبب نہیں بنی، آخر کیوں؟ بلکہ وہ ان کی روایات کی اسانید کو حسن قرار دیتے رہے۔ اور امام بخاری کو اس کا مولف بتلاتے رہے۔ مولانا مرحوم کا الأدب المفرد سے استدلال کرنے کے چند حوالے ملاحظہ فرمائیے:

❶: قال: وسنده حسن. وقال: وقال الألباني: حسن الإسناد. (أضواء المصابيح في تحقيق مشكاة المصابيح: ۱/ ۶۱، ۹۷)

❷: قال: وسنده حسن. و قال: وسنده حسن لذاته و أخطا من ضعفه. (موطأ إمام مالك رواية ابن القاسم؛ ترجمہ، تحقیق وحواشی از مولانا زبیر، ص: ۱۵۲، ۲۷۲، ۴۴۶، ۴۸۱، ۴۹۶، ۶۰۲)

❸: تحقيقي مقالات: ۳/ ۲۱۳.

❹: صحیح بخاری پر اعتراضات کا علمی جائزہ از شیخ زبیر (ذیل صحیح بخاری کا دفاع)، ص: ۲۵۵.

❺: قال: وسنده حسن. (هدية المسلمين، ص: ۱۱۶)

❻: تحقيق جزء علي بن محمد الحميري، ص:٢١، ٢٥، ٢٧، ٣٩.

❼: تحفة الأقوياء في تحقيق كتاب الضعفاء، ص١٠٣، ١١٠، ١١٩.

❽: فضائل درود وسلام، ص: ٤٤، ١٥٠.

قارئین کرام! یہ الادب المفرد سے مولانا مرحوم کے استدلال کی معمولی سی جھلک ہے، ورنہ اصل حوالے کہیں زیادہ ہیں۔

### ۱۰۔السنة لعبد الله بن أحمد:

امام عبداللہ بن امام اہل السنۃ احمد بن حنبل کی معروف کتاب ''کتاب السنة'' دو جلدوں میں مطبوع ہے۔ڈاکٹر محمد بن سعید بن سالم القحطاني نے اس کی تحقیق میں چھ مخطوطات کو پیشِ نظر رکھا۔

اس کتاب کو امام عبداللہ سے ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن خالد الهروي روایت کرتے ہیں اور ان سے ابونصر محمد بن حسن بن سلیمان السمسار بیان کرتے ہیں۔(مقدمہ کتاب السنۃ:۱/۱۰۲)

❁......ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم الهروي تلمیذ امام عبداللہ کا ترجمہ نہیں ملا، جیسا کہ محققِ کتاب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔(حاشیہ کتاب السنۃ:۱/۱۰۲) ابوادریس شریف بن صالح المصري نے بھی عدمِ واقفیت کا اعتراف کیا ہے۔(ري الظمآن بتراجم شيوخ ابن حبان:۲/ ۷۸۰، ترجمہ: ۲۹۳)

امام ابن حبان نے المجروحين، الثقات اور روضة العقلاء میں ان سے استفادہ کیا ہے۔ابوعبداللہ الهروي سے کل تین راوی بیان کرتے ہیں۔(ري الظمآن:۲/ ۷۸۰)

❁......ابونصر محمد بن حسن بن سلیمان السمسار کا بھی ترجمہ نہیں ملا۔

گویا شیخ مکرم کے سندِ کتاب کو پرکھنے کے اُصول کے مطابق یہ بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔مگر اس کے باوجود دیکھیے کہ وہ اس کتاب سے کس قدر استفادہ کرتے ہیں بلکہ بعض مقامات پر مخطوط کا حوالہ بھی دیتے ہیں اور اس کی اسانید کو حسن و صحیح بھی کہتے ہیں:

①......موطأ امام مالک؛ ترجمہ و تحقیق و حواشی از مولانا زبیر، ص: ۹۴، ۳۳۱، ۵۶۳۔

②......قال: سنده صحيح. (اضواء المصابیح:۱/۱۱۶) وقال: سنده حسن. (اضواء المصابیح:۱/۱۵۵)

③......تحقیق جزء رفع الیدین للبخاري، ص:۷۱۔

④......قال: وسنده صحيح.(نصر الباری،ص:۱۹۹)

⑤......قال: و إسناده صحيح. وقال: وسنده صحيح. (مقالات:۱/۳۱۴، ۴۴۴، ۵۴۷، ۵۷۳)

⑥......قال: وسنده صحيح. بہ حوالہ مخطوط، ص:۵۲ (مقالات:۲/ ۲۸۔ص:۵۳ دو حوالے)

⑦......چار حوالے، دو کے بارے میں کہا: وسنده صحيح. (مقالات:۴/ ۷۸)۔پانچ حوالے، سبھی کے بارے میں کہا: وسنده صحيح. بہ حوالہ مخطوط، ص:۸۸. (مقالات:۴/ ۷۹)۔ تین حوالے، ایک کے بارے میں کہا: وسنده صحيح. (مقالات:۴/ ۸۹)۔چار حوالے، تین کے بارے میں کہا: وسنده صحيح. (مقالات:۴/ ۹۰)۔دو حوالے: وسنده صحيح. (مقالات:۴/ ۹۱)۔تین حوالے، ایک کو صحیح، دو کو حسن کہا ہے۔(مقالات:۴/ ۲۱۸)

⑧......بہ حوالہ مخطوط، ص:۴۵۔(مقالات:۶/ ۴۱)

⑨......قال: سنده حسن، و أخطأ القحطاني فقال: في إسناده لين. (فتاویٰ علمیہ:۱/ ۳۱)۔وقال: وسنده صحيح. (فتاویٰ علمیہ:۱/ ۴۵، ۱۷۸، ۱۹۱)

⑩......قال: وسنده صحيح. (فتاویٰ علمیہ:۲/ ۳۸۴، ۳۹۴)۔وقال: وسنده صحيح. بہ حوالہ مخطوط۔(فتاویٰ علمیہ:۲/ ۳۹۸)

⑪......نور العینین فی اثبات رفع الیدین، ص:۳۵۲۔

⑫......بدعتی کے پیچھے نماز کا حکم، ص: ۹ دو حوالے، ایک کے

بارے میں وسندہ صحیح کہا۔ص: ۱۰ تین حوالے، تینوں کے بارے میں کہا: وسندہ صحیح۔ص: ۸۰ تین حوالے مخطوط۔ص: ۸۱ تین حوالے، ایک کے بارے میں کہا: وسندہ صحیح۔ص: ۸۲ تین حوالے، سبھی کے بارے میں لکھا: وسندہ صحیح۔ص: ۸۳ دو حوالے، وسندہ صحیح۔

⑬......اہلِ حدیث ایک صفاتی نام، ص: ۱۰۴۔

⑭......قال: وسندہ صحیح .بہ حوالہ مخطوط۔(توفیق الباری فی تطبیق القرآن وصحیح البخاری (ضمن صحیح بخاری کا دفاع)، ص: ۱۷)

⑮......سندہ صحیح .(مقالات الحدیث: ۲۰۰۴ء تا ۲۰۱۰ء، تحقیق ونظر ثانی: حافظ زبیر علی زئی، ص: ۱۳۷)

⑯......دو حوالے۔(تحفۃ الاقویاء، ص: ۱۱۲)

⑰......ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، حضرو (شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۶۴۔ مئی تا اگست ۲۰۱۵ء) میں مولانا ندیم ظہیر نے مولانا مرحوم کے مضمون میں السنۃ کے حوالے کو شائع کیا ہے جس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

## ۱۱۔جزء الحمیري:

امام علی بن محمد الحمیري (وفات: ۳۲۳ھ) کا ستاون احادیث پر مشتمل ایک جزء ہے جس کی تحقیق مولانا شیخ زبیر نے ۱۴۱۳ھ میں کی، دار الطحاوي (الریاض) اور حدیث اکادمی (فیصل آباد) نے اسے شائع کیا۔ ازاں بعد شیخ مکرم نے سابقہ ایڈیشن میں خاصی اغلاط کی وجہ سے از سرِ نو تحقیق کر کے ۱۴۳۶ھ میں مکتبہ اسلامیہ (فیصل آباد، لاہور) سے طبع کروایا۔

اس جزء کے ناسخ حافظ ابن عساکر کے استاد ابو البرکات عمر بن ابراہیم العلوی الزیدی الکوفی الحنفي (وفات: ۵۳۹ھ) ہیں۔ شیخ کے اُصول کے مطابق ایسے راوی کا ثقہ وصدوق ہونا سندِ کتاب کی صحت کے لیے شرط ہے۔ مگر وہ کسی محدث سے اس کا صراحتاً ثقہ یا صدوق ہونا ثابت نہیں کر سکے، بلکہ اُنھوں نے اعتراف کیا:

”و اتھم بالبدعۃ والرفض والاعتزال ولکن لم یتھمه أحد في روایته فمحله الصدق في الحدیث، ولنا صدقه وعلیه بدعته.“

(مقدمہ تحقیق: ص: ۱۲)

”اس پر بدعت، رافضیت اور اعتزال کی تہمت ہے لیکن کسی (محدث) نے اسے روایتِ حدیث میں متہم نہیں کیا۔ بنا بریں حدیث کے بارے میں وہ محلِ صدق میں ہے۔ ہمیں اس کی صداقت سے سروکار ہے، اس کی بدعت کا وبال اسی پر ہے۔“

اس کتاب کی استنادی کمزوری چھپانے کے لیے شیخ مرحوم نے نہایت عجیب اسلوب اختیار کیا کہ اس راوی کو کسی نے متہم قرار نہیں دیا، لہٰذا وہ محلِ صدق میں ہے۔

سوال ہے کہ کیا ہر غیر متہم راوی محلِ صدق میں ہوتا ہے؟ کس محدث نے اس کی ادنیٰ سی تعدیل کی ہے؟ وہ محلِ صدق میں کس دلیل کی اساس پر داخل ہو گیا؟ اس کی بیان کردہ سند کیسے حسن ہو گئی؟

حالانکہ ان کے اُصول کے مطابق یہ جزء ثابت نہیں ہوتا، اس کے باوجود اُنھوں نے چودہ (۱۴) روایات پر إسنادہ صحیح اور چار (۴) احادیث پر إسنادہ حسن کا حکم لگایا ہے!

گویا شیخ سمجھ چکے تھے کہ جو اُصول اُنھوں نے اختیار کیا ہے اس پر جزء الحمیري پورا نہیں اُتر سکتا، لہٰذا اُنھیں اس ”بے اصل“ جزء سے بھی براءت کا اعلان کرنا چاہیے تھا، نہ کہ اس کی از سرِ نو تحقیق کر کے اسے دوبارہ شائع کرنا چاہیے تھا! اپنی محنت کے ضیاع کا احساس تو رہا، مگر امام ترمذی کی کد و کاوش کو بھلا دیا گیا!

## ۱۲۔علل الدارقطني:

امام نسائی کے بعد علل الحدیث میں شہرت پانے والے امام دارقطنی ہیں۔ ان کی معروف کتاب العلل الواردۃ في الأحادیث النبویۃ ہے۔ یہ کتاب امام صاحب نے زبانی املا کروائی تھی۔ اور سولہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ آخری جلد میں فہارس ہیں۔ اس کی ابتدائی گیارہ جلدوں کی تحقیق ڈاکٹر محفوظ الرحمان

زین اللہ السلفی نے کی ہے۔ باقی جلدوں پر شیخ حمد بن صالح بن محمد الدباسی کا کام ہے۔ یہ دونوں تحقیقات مختلف اشاعتی مراکز سے شائع ہوئی ہیں۔

اس کتاب کی متصل سند مخطوط پر موجود نہیں، بلکہ سرے سے سند ہی موجود نہیں۔ محقق کتاب ڈاکٹر محفوظ الرحمان سلفی رقم طراز ہیں:

''بلاشبہ حافظ دارقطنی کی العلل الواردة في الأحاديث النبوية کی بابت ایک ضخیم کتاب موجود ہے۔ میں نے اس کا باسند نسخہ تلاش کرنے کی بھرپور تگ ودو کی ہے کہ وقت نے ہمارے لیے حوادثاتِ زمانہ سے اس کی حفاظت کی ہو۔ مگر مجھے اس پر دسترس حاصل نہیں ہوئی۔ مجھے جتنے نسخے بھی تا حال میسر آئے ہیں، وہ مولف تک متصل سند سے خالی ہیں۔'' (مقدمہ تحقیق:۱/۵۹)

ازاں بعد متعدد قرائن اور اقوالِ علماء سے اس کتاب کو امام دارقطنی کی تصنیف ثابت کیا ہے۔ (مقدمہ تحقیق:۱/۵۹-۶۶)

اس کتاب کی سند نہ ہونے کے باوجود شیخ مکرم اسے امام دارقطنی کی کتاب ہی قرار دیتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

① ......''امام دارقطنی کی مشہور کتاب العلل سولہ (۱۶) جلدوں میں مع تحقیق وفہرست چھپی ہوئی ہے۔ یہ ساری کتاب امام دارقطنی نے زبانی لکھوائی تھی۔ (دیکھیے تاریخ بغداد للخطیب البغدادي:۱۲/۳۷ وسندہ صحیح)۔''

(موطأ؛ رواية ابن القاسم، ص: ۴۹)

② ......''کتاب العلل کی گیارہ جلدیں چھپ چکی ہیں اور مزید جلدیں چھپ رہی ہیں۔ یہ فنِ حدیث کے مشکل ترین علم میں عظیم الشان کتاب ہے جسے حافظ امام دارقطنی نے زبانی لکھوایا ہے۔

یہ کتاب اب سولہ جلدوں میں مطبوع ہے، والحمدللہ۔''

(تحقیقی مقالات:۳/۳۴۴)

اور کئی مقامات پر اُنھوں نے اس کتاب سے امام دارقطنی کے اقوال وغیرہ نقل کیے ہیں:

❶......سنده صحيح .(مقالات:۲/۱۰۱) وزيادة الثقة مقبولة . (مقالات:۲/۵۴۵)

❷......(مقالات:۳/۱۲۶، ۱۳۶) دو حوالے۔ (مقالات:۳/ ۲۵۲، ۳۰۳، ۳۲۵، ۳۴۴)

❸......مقالات:۴/۱۳۱، ۴۴۰۔

❹......مقالات:۶/۵۲، ۱۱۴، ۲۸۸۔

❺......فتاویٰ علمیہ:۱/۴۴۶، ۴۵۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۶۴۹۔

❻......فتاویٰ علمیہ:۲/۱۰۱۔

❼......فتاویٰ علمیہ:۳/۱۸۰۔

❽......اضواء المصابیح:۱/۸۳، ۱۵۳۔

❾...... نور العينين، ص:۱۳۱، ۱۶۸، ۲۹۳، ۳۳۳، ۳۷۴، ۳۸۴، ۳۹۶، ۴۰۵، ۴۱۵۔ تین حوالے، ص:۵۱۶۔

❿......الفتح المبين في تحقيق طبقات المدليسن، ص: ۸۲ .

⓫......تحقيق جزء علي بن محمد الحميري، ص: ۴۹ .

⓬......تحقیق جزء رفع الیدین، ص:۳۲۔

⓭......دین میں تقلید کا مسئلہ، ص:۳۷۔

⓮...... بہ حوالہ مخطوط۔ (نماز میں ہاتھ باندھنے کا حکم اور مقام، ص:۲۳)

⓯......مسئلہ فاتحہ خلف الامام، ص:۸۷۔

⓰......مقالات الحدیث، ص:۳۶۱۔

⓱......فضائل درود وسلام، ص:۴۲، ۴۴۔

سوال یہ ہے کہ بہ ایں صورت علل الدارقطنی معتبر ہے تو علل الترمذی کیوں معتبر نہیں ہوسکتی؟ (جاری ہے)

# سندِ کتاب میں منہجی غلطی کا جائزہ

محمد خبیب احمد (ادارہ علوم اثریہ، فیصل آباد)

## ۱۳۔سؤالات أبي داود للإمام أحمد:

امام ابوداود نے امام احمد سے جوسوالات کیے اور امام احمد نے ان کے جو جوابات دیے، نیز امام ابوداود نے جرح وتعدیل کے بارے میں امام احمد سے جوسنا، اُنھوں نے اس کتاب میں ذکر کر دیا ہے۔اس مطبوع کتاب میں پانچ صد ستر (۵۷۰) فقرے ہیں۔عجیب بات یہ ہے کہ اس کتاب کوکسی نے امام ابوداود یا امام احمد کی تصنیفات میں ذکر نہیں کیا، سوائے فواد سزگین، شیخ البانی اور یاسین محمد السواس کے، اُنھوں نے ذکر کیا ہے کہ مکتبہ ظاہریہ (دمشق) میں اس کا مخطوط موجود ہے۔جس کی تفصیل محقق کتاب شیخ زیاد محمد منصور نے مقدمہ تحقیق میں ذکر کی ہے۔(سؤالات،ص:۱۰۱)

اس کے قلمی نسخے کی سند بھی موجود نہیں، سوائے سند کے کچھ حصے کے۔

ڈاکٹر زیاد رقم طراز ہیں:

(۱) ''مولف تک نسبتِ کتاب کی تحقیق: اس کتاب کو اصحابِ مصادر نے امام احمد یا امام ابوداود کی تصنیفات میں ذکر نہیں کیا، سوائے اس چھوٹے پیانے کے جس کا ذکر ابھی ہوا کہ مکتبہ ظاہریہ (دمشق، شام) کی فہرستوں کے ذریعے سے۔'' (مقدمہ تحقیق،ص:۱۰۳)

(۲) ''جو قیمتی نسخہ میرے سامنے ہے، میں اس کی سند پر مطلع نہیں ہوا، سوائے کچھ حصے کے جو کتاب کے بعض ابواب کے شروع میں ہے۔اس میں ہے:أخبرنا أو حدثنا الحسين حدثنا سليمان قال: سمعت أحمد وتارة: قلت لأحمد۔'' (مقدمہ تحقیق،ص:۱۲۳)

گویا یہ کتاب بھی شیخ کے اُصول کے مطابق غیر معتبر ہے۔مگر اس کے باوجود اُنھوں نے اس کتاب کے متعدد حوالے دیے ہیں، مثلاً:

①......مقالات:۴/۴۵۶۔

②......مقالات:۶/۱۳۷-۱۳۹۔

③......فتاویٰ علمیہ:۲/۳۵۳،۳۵۴۔

مولانا موصوف نے اس کتاب کو امام ابوداود کی تالیفات میں ذکر کیا ہے۔(تحقیقی مقالات:۶/۱۱۹)

## ۱۴۔الرسالة إلى أهل مكة:

امام ابوداود (صاحب السنن) نے سنن ابی داود کے تعارف کے لیے باشندگانِ مکہ کی طرف ایک خط ارسال کیا جو ''رسالة الإمام أبي داود السجستاني إلى أهل مكة في وصف سننه'' کے نام سے مطبوع ہے۔

مولانا زبیر نے اپنی کتاب ''اہل حدیث: ایک صفاتی نام اور اجماع'' کے تحت چھٹا حوالہ امام ابوداود کا ذکر کیا ہے۔امام صاحب کا قول نقل کرنے کے بعد یوں حوالہ دیا ہے:

''رسالة أبي داود إلى أهل مكة في وصف سننه، ص:۳۰ و مخطوط، ص:۱.''

(اہل حدیث ایک صفاتی نام،ص:۳۰)

نیز امام ابوداود کے حالاتِ زندگی میں ان کی علمی خدمات میں ''رسالة في وصف تأليفه لكتاب السنن'' کا ذکر کیا ہے۔(تحقیقی مقالات:۶/۱۱۹)

حالانکہ اس کتاب کو امام ابوداود سے روایت کرنے والے ابوبکر محمد بن عبدالعزیز الہاشمی ہیں۔(رسالة الإمام أبي داود إلى

أهل مكة في وصف سننه، ص: ٣٠. تحقيق: عبدالفتاح أبوغدة)

اس راوی کی توثیق موجود نہیں، البتہ امام ابن جُمیع الصیداوي (وفات:۴۰۲ھ) نے انھیں اپنے اساتذہ میں ذکر کیا ہے۔(معجم الشیوخ للصیداوي، ص: ١٢٦، ترجمة: ٧٨) اور متذکرہ بالا رسالے کا بھی ذکر کیا ہے۔

شیخِ مکرم کی قائم کردہ کسوٹی پر یہ رسالہ بھی پورا نہیں اترتا، لہٰذا اِسے امام ابوداود کی طرف منسوب کرنا چہ معنی دارد؟

ہمارے نزدیک یہ رسالہ ثابت ہے، چنانچہ امام ابوداود رقم طراز ہیں:

''اس سنن میں کتب کی تعداد اٹھارہ اجزاء پر مشتمل ہے جن میں مراسیل بھی شامل ہیں۔(ان اٹھارہ) میں سے ایک جزمراسیل پر مبنی ہے۔'' (الرسالة،ص:۵۱)

غور طلب بات یہ ہے کہ سنن ابی داود میں علیحدہ طور پر مراسیل موجود نہیں۔ جس کا تقاضا ہے کہ ایک مستقل کتاب موجود ہونی چاہیے۔ اور یہ کتاب ''کتاب المراسیل'' کے نام سے مطبوع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوداود نے اسے السنن کے آخر میں درج کیا تھا، ازاں بعد علیحدہ چھپتی رہی۔ جس طرح امام ترمذی نے سنن ترمذی کے آخر میں علل الترمذي الصغیر کو ملحق کیا ہے جو اب بھی سنن کے ساتھ مطبوع ہوتی ہے۔

گویا امام ابوداود نے اپنے خط میں جہاں سنن ابی داود کا تعارف کروایا وہاں ''المراسیل'' کا بھی ذکر کر دیا۔ اور یہ بات معروف ہے کہ اہلِ علم اپنی ایک کتاب میں دوسری کتب کا احالہ کرتے ہیں۔

محدثین کی ایک معتدبہ جماعت نے مصطلح الحدیث اور تخریج الحدیث کی کتب میں اس رسالے کا ذکر کیا ہے یا اس سے امام ابوداود کے اقوال نقل کیے ہیں۔ بلکہ مولانا زبیر کے نقل کردہ دو اقوال ابھی مذکور ہوئے ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہیں کہ مولانا موصوف بھی اسے امام ابوداود ہی کا خط سمجھتے تھے۔

مولانا مرحوم اس خط کو امام ابوداود کا خط قرار دے کر لکھتے ہیں:

''تنبیہ: سؤالات الآجري کے نام سے جو کتاب مطبوع و مخطوط ہے وہ ابوعبید الآجری (مجہول) کی وجہ سے امام ابوداود سے ثابت ہی نہیں۔'' (تحقیقی مقالات:٦/١١٩)

حالانکہ رسالة أبي داود کو امام صاحب سے بیان کرنے والے راوی کی توثیق بھی مطلوب ہے! ان کے اُصول کے مطابق اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ سؤالات الآجري کی امام ابوداود کی طرف نسبت کی نفی اور رسالة أبي داود کی صحتِ نسبت کا اثبات، چہ معنی دارد؟

### ۱۵۔تسمية الإخوة لأبي داود:

''تسمية الإخوة الذين روي عنهم الحديث'' کا شمار بھی امام ابوداود کی تصانیف میں ہوتا ہے۔ آٹھ اوراق پر مشتمل یہ کتابچہ دار الکتب الظاهرية (دمشق) کی زینت تھا جسے ڈاکٹر باسم فیصل الجوابرۃ نے تحقیق کے بعد شائع کیا۔

یہ رسالہ (۹۲۴) فقروں پر مشتمل ہے۔ اس کے راوی بھی ابوعبید آجری ہیں۔ امام ابوداود نے یہ کتاب امام علی بن المدینی کی کتاب ''تسمية من روي عنه من أولاد العشرة وغيرهم من أصحاب رسول الله ﷺ'' کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کی ہے جس کی اُنھوں نے وضاحت بھی کی ہے۔

(تسمية الإخوة لأبي داود، ص: ١٦٢)

امام ابوداود کا یہ رسالہ ''الرواة من الإخوة والأخوات'' کے ضمن میں مطبوع ہے۔ جسے دار الراية (الریاض) نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں پہلی کتاب امام علی بن مدینی کی، دوسری امام ابوداود کی اور تیسری کتاب خود محقق کی ہے جو ان دونوں کتب پر استدراک ہے۔

امام ابوداود کے رسالے میں ابوعبید آجری کی جہالت کے علاوہ محمد بن علي بن عدي بن زحر المنقري بھی ہے

جس پر تبصرہ ''سؤالات الآجري'' کے تحت گزر چکا ہے۔لیکن اس کے باوجود کسی نے اس کتاب کو امام ابوداود کی طرف منسوب کرنے میں شک کا اظہار نہیں کیا!

## ۱۶۔الإقناع لابن المنذر:

شیخ مکرم لکھتے ہیں:

''ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث پیش کر کے امام ابن المنذر نے لکھا ہے: پس اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے قربانی واجب وفرض نہیں۔ کیوں کہ اگر یہ فرض ہوتی تو اسے قربانی کرنے والے کے ارادے پر موقوف نہ کیا جاتا۔(الإقناع لابن المنذر: ۱/ ۳۷۶)۔''

(تحقیقی مقالات:۶/۲۸۵)

اس کتاب کو امام ابن منذر سے ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابراہیم البلخي روایت کرتے ہیں۔(الإقناع لابن المنذر: ۱/ ۴۳)ان کی بھی توثیق موجود نہیں۔ان کا مختصر ترجمہ تاریخ الإسلام للذهبي(ص:۵۴۷ . حوادث ووفيات: ۳۵۱ھ-۳۸۰ھ)اور غاية النهاية لابن الأثير (۲/۵۱، ترجمہ: ۲۷۰۳۔الشاملۃ) میں موجود ہے۔ اور قدرِ مفصل ذکر الأنساب للسمعاني (۱/ ۳۸۹، البلخي)اور تاریخ دمشق (۱۴/ ۳۲۵)وغیرہ میں ہے۔

**تنبیه**: الإقناع لابن المنذر کے محقق ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالعزیز الجبرین نے ابوعبداللہ البلخي کے شاگرد ابوعبداللہ محمد بن یمن المرادي کے بارے میں لکھا ہے کہ مجھے اس کا ترجمہ نہیں ملا۔ (الإقناع: ۱/ ۴۳)

حالانکہ ان کا ترجمہ كتاب الصلة لابن بشكوال (۲/ ۱۳۹، ترجمہ:۱۰۲۳) میں ہے۔اور لکھا ہے:

"وكان رجلا فاضلا خطيبا ......وأثنوا عليه . "

''وہ فاضل اور خطیب آدمی تھے......انھوں (علماء) نے ان کی تعریف کی ہے۔''

شیخِ مکرم کے اُصول کے مطابق یہ بھی صراحتاً توثیق نہیں، لہٰذا کتاب الإقناع کی سند مزید مشکوک ہوگئی۔

## ۱۷۔معرفة الرجال لابن محرز:

معرفة الرجال للإمام أبي زكريا يحي بن معين رواية أبي العباس ابن محرز البغدادي مطبوع اور متداول ہے۔امام ابن معین سے ان سوالات کے راوی ابوالعباس احمد بن محمد بن القاسم بن محرز البغدادي ہیں جن کی توثیق موجود نہیں، البتہ ان کا دوسطری ترجمہ تاریخ بغداد(۵/۸۳) میں موجود ہے۔لہٰذا یہ بھی مجہول راوی ہیں۔

**دوسري علت**: ابن محرز کا شاگرد ابوالفضل بن درستویہ بن المرزبان الفسوي الفارسي ہے۔(معرفة الرجال:ص،۴۳) اس کا ترجمہ الإکمال لابن ماکولا (۳/۳۲۲) میں ہے۔ صاحبِ کتاب نے اس کے تین استاد اور ایک شاگرد کا ذکر کیا ہے۔ اس کا نہایت مختصر ترجمہ المشتبه للذهبي (۱/ ۲۸۵)، توضيح المشتبه لابن ناصر الدين الدمشقي (۳/ ۹۲)، تبصير المنتبه لابن حجر العسقلاني(۲/ ۵۵۹) میں ہے۔مؤخر الذکر دونوں محدثین کا مرجع حافظ ذہبی کی کتاب ہے اور ان کا مرجع الإکمال لابن ماکولا ہے۔

عبداللہ بن جعفر بن درستویہ ابومحمد کے ترجمے میں خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

"جعفر بن درستويه من كبار المحدثين وفهمائهم . " (تاريخ بغداد: ۹/ ۴۲۹)

''جعفر بن درستویہ کا شمار کبار اور سمجھ دار محدثین میں ہوتا ہے۔''

یہ تعریفی کلمات ہیں، توثیقی نہیں۔ان دونوں راویوں کے علاوہ سندِ کتاب کے باقی راوی ثقہ ہیں۔

اسی ضعیف سند سے خطیب بغدادی نے باسٹھ (۶۲) اقوال نقل کیے ہیں۔(موارد الخطیب للدکتور أکرم ضیاء العمري، ص: ۵۷۶)

حافظ ابن عساکر نے بھی اسی سند سے متعدد اقوال نقل کیے ہیں جو بعینہٖ معرفة الرجال لابن محرز میں موجود ہیں:

(۱) "قال ابن معین: لابأس به." (تاریخ دمشق:۳۴/ ۱۸ . دیکھیے معرفة الرجال، فقرة: ۳۵۶، ۱۵۳۷)

(۲) "قال ابن معین: لابأس به." (تاریخ دمشق: ۶۰/ ۳۰۸ . دیکھیے معرفة الرجال، فقرة: ۳۵۵، ۱۵۳۷)

(۳) تاریخ دمشق: ۶۵/ ۱۰۵، ۱۰۶ . دیکھیے معرفة الرجال، ص: ۵۹۹ .

کسی خارجی قرینے سے اس کتاب کا غلط ہونا معلوم نہیں ہوتا، لہٰذا یہ کتاب بھی فنِ جرح وتعدیل میں امام ابن معین کی امامت پر دلالت کرتی ہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ امام ابن معین نے ابراہیم بن ابی اللیث کے بارے میں لکھا ہے:

''اگر اسی (۸۰) افراد بھی اس کے پاس آمد و رفت رکھیں، سبھی منصور بن معتمر کی طرح ہوں تو وہ پھر بھی جھوٹا ہوگا۔''(معرفة الرجال لابن محرز، ص: ۱۳۸، ۱۳۹، فقرة: ۳۶۶)

اور علامہ معلّمی نے اس قول کے ناقل ابن محرز پر کیوں اعتراض کیا اور اس کی جہالت کی طرف کیوں اشارہ کیا؟

(التنکیل للمعلمي: ۱/ ۹۰، ترجمہ: ۷)

ہمارے نزدیک ایسا نقد محلِ نظر ہے کیوں کہ ابن محرز محض خطیب بغدادی کی ذکر کردہ جرح ہی کا راوی نہیں بلکہ اس نے امام ابن معین اور امام ابن المدینی سے جرح وتعدیل کی بابت ایک معتد بہ حصہ محفوظ کیا ہے جو اُس کے اہلِ علم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ نیز اس جرح کو نقل کرنے میں ابن محرز منفرد نہیں بلکہ دیگر رواۃ بھی ابن ابی اللیث پر امام ابن معین کی شدید جرح نقل کرتے ہیں۔

اولاً: امام ابن معین نے اس کی توثیق کی تھی، بعدازاں جب اس کی حقیقت عیاں ہوگئی تو نہایت شدید جرح کی، جیسا کہ خطیب بغدادی نے بھی صراحت کی ہے۔(ملاحظہ ہو، تاریخ بغداد:۶/ ۱۹۱-۱۹۲)

ثانیاً: معرفة الرجال کے مطبوعہ نسخے پر علمائے کرام کے سماعات بھی ہیں۔(ملاحظہ ہو معرفة الرجال (سماعِ اول)، ص: ۲۴۶، ص: ۲۴۷ سماعِ دوم، ص: ۲۴۸، سماعِ سوم، ص: ۴۴۰)

**تنبیہ**: التنکیل (۱۰/ ۱۵۹ طبع جدید) میں ابن محرز کے شاگرد کا نام "عبد اللّٰه بن جعفر بن درستویه بن المرزبان الفارسي" مذکور ہے۔ درست جعفر بن درستویه ہے، عبد الله بن جعفر درستویه نہیں۔ علامہ معلّمی نے بھی صحیح لکھا تھا، جیسا کہ التنکیل (۱/ ۹۰ طبع قدیم) میں موجود ہے۔ اور اس سلسلے میں چند حوالے آپ پہلے بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

## ۱۸۔ أخبار القضاة لوکیع:

مولانا زبیر مرحوم مقاتلیة اور جهمیة کی مذمت کے بارے میں قاضی ابو یوسف حنفی کے ایک قول کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"أخبار القضاة المنسوب إلی محمد بن خلف بن حیان :۳/ ۲۵۸ . وسنده صحیح ."

(تحقیقی مقالات:۱/ ۵۴۷)

سوال صرف اتنا ہے کہ منسوب (غیر ثابت!) شدہ کتاب میں مذکور قاضی ابو یوسف کا قول اگر ثابت ہوسکتا ہے تو العلل الکبیر منسوب شدہ کتاب (بہ قولِ شیخ!) سے امام بخاری کا قول "ما أقل تدلیسه" کیوں ثابت نہیں ہوسکتا!

ابھی آپ پڑھیں گے کہ موصوف نے العلل الکبیر کی متعدد سندوں پر درستی کا حکم لگایا ہے۔ گویا ان کے نزدیک کتاب کی نسبت اور اس میں مواد کی صحت دونوں علیحدہ چیزیں ہیں۔ اور یہی منہجِ محدثین ہے۔

### ۱۹۔العلل الکبیر حسن لذاتہ بھی ہے:

امام اسماعیل بن اسحاق قاضی (وفات: ۲۸۲ھ) کا جزءِ حدیث "فضل الصلاة علی النبي ﷺ" مطبوع اور متداول ہے۔ اس کا قلمی نسخہ محدث البانی نے مکتبہ ظاہریہ (دمشق، شام) سے لے کر تحقیق کے بعد شائع کیا۔ اس کا سنِ طباعت ۱۹۶۳ء ہے۔ یہ جزء (۱۰۶) احادیث پر مشتمل ہے۔

مولانا حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ نے بھی ترجمہ و تحقیق کر کے اسے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے ایک راوی علی بن ہبۃ اللہ بن عبدالصمد الکاملي المصري کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''مرشد بن یحییٰ کے شاگرد ابو الحسن علی بن ہبۃ اللہ بن عبدالصمد الکاملي المصري تھے جن سے جلیل القدر شاگردوں کی ایک تعداد نے روایتیں بیان کی ہیں، مثلاً: حافظ عبدالغنی، حافظ عبدالقادر، ابن رواحہ اور محمد بن الملثم وغیرہم۔ (دیکھیے تاریخ الإسلام للذھبی: ۴۰/۳۳۳ وفیات: ۵۷۱ھ-۵۸۰ھ) آپ کا مقام "محله الصدق" ہے۔ کئی مقامات پر دوسرے راویوں نے آپ کی متابعت کی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ صدوق تھے۔ یاد رہے کہ آپ پر کسی قسم کی کوئی جرح نہیں ہے اور امام عبدالغنی المقدسی کا کسی جرح کے بغیر آپ کو ''الشیخ'' کہنا بھی آپ کی توثیق کی طرف اشارہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ سند حسن ہے۔ روایات کی تخریج سے معلوم ہوتا ہے کہ علی بن ہبۃ اللہ صدوق تھے، کیوں کہ یہی روایات دوسری کتابوں میں بھی کثرت کے ساتھ موجود ہیں، لہٰذا یہ سند صحیح لغیرہ ہے، والحمدللہ۔''

(فضائلِ درود وسلام، ص: ۳۵، ۳۶)

ان کے اس کلام پر تبصرہ آئندہ آرہا ہے، إن شاء اللّٰہ. سرِدست یہ دیکھیے کہ موصوف نے علی بن ہبۃ اللہ کو صدوق قرار دیتے ہوئے سندِ کتاب کو حسن قرار دیا، پھر اس کی سند کو صحیح لغیرہ کہہ دیا۔ کیوں کہ ''یہی روایات دوسری کتابوں میں بھی کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔''

اس جملے میں دو احتمال ہیں، اول: فضل الصلاة علی النبي ﷺ کی روایات دوسری کتب میں بہ کثرت موجود ہیں۔ دوم: سندِ کتاب صحیح لغیرہ ہے کیوں کہ دوسری کتابوں میں نہایت کثرت سے موجود ہے۔

ان دونوں میں سے پہلے احتمال کی تائید دلیل کرتی ہے۔ دوسرا احتمال نہایت کمزور ہے۔ شیخ کے "صحیح لغیرہ" کے اُصول سے ہم نے یہ کشید کیا کہ جس کتاب کی روایات دوسری کتب میں موجود ہوں تو وہ حسن لذاته کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ اب اس اصول کو العلل الکبیر پر منطبق کریں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بھی حسن لذاتہ ہے کیوں کہ اس کی بھی بہت سی نصوص دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔ اگر اس کا راوی بھی صدوق ہوتا تو یہ بھی صحیح لغیرہ کے رتبے تک پہنچ جاتی۔

### راویِ کتاب صدوق نہیں:

مولانا مرحوم نے علی بن ہبۃ اللہ کی توثیق کے بارے میں دو الفاظ ذکر کیے ہیں: (۱) محله الصدق، (۲) صدوق.

"محله الصدق" کی دلیل اُنھوں نے یہ بیان کی کہ ان سے جلیل القدر شاگرد بیان کرتے ہیں۔ صدوق قرار دینے کے ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱: کئی مقامات پر دوسرے راویوں نے آپ کی متابعت کی ہے۔
۲: آپ پر کسی قسم کی کوئی جرح نہیں۔

۳: امام مقدسی نے بغیر جرح کے آپ کو سندِ کتاب میں ''الشیخ'' سے موصوف کیا ہے۔

پہلی دلیل کے حوالے سے عرض ہے کہ کن کن راویوں نے آپ کی متابعت کی ہے؟ کاش! مولانا اس کی صراحت فرما دیتے۔

محدث البانی نے بھی صرف ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن علی بن مسعود بن ثابت البوصیري کی متابعت ذکر کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ نجم الدین عمر بن محمد (وفات: ۸۸۵ھ) جو ابن فہد کی نسبت سے معروف ہیں، نے اپنی کتاب ''الفتح الرباني لجميع مرويات الشيخ أبي الفتح العثماني'' میں ذکر کیا ہے کہ ابو الفتح العثماني کے مسموعات میں فضل الصلاة على النبي ﷺ شامل ہے۔

ازاں بعد تذکرة الحفاظ کے حوالے سے بھی ابوالقاسم البوصیري موصوف کی سند ذکر کی ہے۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ تحقیق فضل الصلاة على النبي ﷺ، ص: ز)

ابوالفتح العثماني سے مراد محمد بن أبي بكر بن حسين بن عمر القرشي العثماني المراغي ہیں جو ۷۷۵ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور ۸۵۹ھ میں انتقال ہوا۔ (الضوء اللامع: ۷/۱۶۲-۱۶۵، ترجمہ: ۴۰۱۔ البدر الطالع: ۲/۱۴۶، ۱۴۷، ترجمہ: ۴۲۵۔ الأعلام للزركلي: ۶/۵۸)

ان کی معجم کا ذکر علامہ عبدالحی عبدالکبیر الکتانی نے بھی کیا ہے، بلکہ امام ابن فہد تک اپنی سند بھی ذکر کی ہے۔

(فهرس الفهارس: ۲/۶۱۷، کتاب: ۲۳۶)

اس کے قلمی نسخے سے شیخ البانی نے نقل کیا ہے۔ اور فهرس مخطوطات دار الكتب الظاهرية (ص: ۱۳۱، رقم الكتاب: ۳۵۹) میں اس کا مختصر تعارف بھی کروایا ہے۔

شیخ زبیر رحمہ اللہ نے اپنی تحقیق میں طبقات الشافعية الكبرى اور سير أعلام النبلاء کا حوالہ دیا ہے۔ (فضائلِ درود وسلام، ص: ۵۶، ۱۴۸، ۱۴۹) مگر ان دونوں محولہ کتابوں میں اس ابو القاسم البوصیري اکیلے کی متابعت ہے، بلکہ علامہ سبکي نے دیگر مقامات پر بھی یہی سند ذکر کی ہے۔

(طبقات الشافعية الكبرى: ۱/۴۳، ۱۵۸)

مزید مراجعت سے معلوم ہوا کہ دیگر مراجع میں بھی یہی سند ہے۔ (ملاحظہ ہو نتائج الأفكار لابن حجر: ۳/۳۰۱، المجلس: ۲۹۱ الشاملة. الثاني من كتاب شعار الأبرار في الأدعية والأذكار من حديث الشيخ الإمام أبي الفرج عبدالرحمان بن الشيخة: ۲/۳۳۵، رقم: ۲۱۸۶، (تخریج: أبي الصفا خليل بن محمد) ضمن: الفوائد لابن منده.) بلکہ مطبوع فضل الصلاة کی سند سے زیادہ مشہور یہ سند ہے۔

لہٰذا اُن کا یہ دعویٰ کہ ''کئی مقامات پر دوسرے راویوں نے آپ کی متابعت کی ہے'' نہایت غیر محتاط طرزِ عمل ہے۔

ان کی دوسری دلیل کہ ''اس راوی پر کوئی جرح نہیں''، اس حد تک تو درست ہے مگر عدمِ جرح سے صدوق ہونے پر ان کا استدلال درست نہیں۔

تیسری دلیل کہ ''امام مقدسی نے بغیر جرح کے ''الشیخ'' کہا ہے، لہٰذا یہ توثیق کی طرف اشارہ ہے'' بھی محلِ نظر ہے۔ کیوں کہ محدثین میں سے کسی نے اس لفظ کے پیشِ نظر اور دیگر قرائن کے باوجود انھیں ثقہ یا صدوق نہیں کہا اور نہ ''اس کی توثیق کی طرف اشارہ'' کا استدلال کیا ہے، سوائے موصوف کے!

**علی بن ہبۃ اللہ کے بارے میں علامہ البانی کی رائے:**

محدث البانی سندِ کتاب کے راویوں کا ترجمہ ذکر کرتے ہوئے علي بن هبة الله کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علي بن هبة الله بن عبدالصمد أبو الحسن الكاملي: میں نے ان کے شایانِ شان ترجمہ ڈھونڈنے کی

کوشش کی ہے مگر مجھے اپنی منشا کے مطابق نہیں ملا۔ حافظ ذہبی نے انھیں "المشتبہ" میں ذکر کیا ہے اور ان کا نسب نامہ اسی طرح بیان کیا ہے جس طرح اسی کتاب "فضل الصلاة علی النبي ﷺ" کی سند میں مذکور ہے، بجز اس کے کہ اُنھوں نے "الصوري" کی نسبت اضافی ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ ابو صادق المدینی سے اس نے سماع کیا ہے۔ بس اتنا ہی کہا اور مزید کچھ نہیں لکھا۔ حافظ ابن ناصر الدین (الدمشقي) توضیح المشتبہ (۲/۲۲۹/۲) میں انھی کے پیچھے چلے ہیں اور خلافِ معمول اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اسی طرح حافظ ابن حجر نے تبصیر المنتبہ بتحریر المشتبہ میں کیا ہے۔

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے انھیں تاریخ دمشق میں ذکر نہیں کیا باوجود اس کے کہ وہ صوري ہیں، جیسا کہ حافظ ذہبی کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ ابن عساکر کا حق بنتا تھا کہ وہ انھیں اپنی کتاب میں ذکر کرتے لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا عبدالصمد کی نسبت صوری ہے، رہے علي بن ھبة اللہ تو وہ مصري ہیں، جیسا کہ حافظ ابن ناصر الدین (الدمشقي) نے مخصوص طریقے سے ذکر کیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ موصوف عبدالصمد اصلاً اصفہان کے باشندے تھے، وہ صور آئے اور اسے مستقل مسکن بنالیا۔ یہاں کے رہائشیوں نے ان کا رشتہ کا ملي خاندان سے کر دیا۔ ہبۃ اللہ کے جو بیٹے پیدا ہوئے ان کا نام علی تھا، پھر ہبۃ اللہ مصر منتقل ہو گئے۔ یہاں ان سے حافظ سِلَفِي نے لکھا۔ اور وہیں فوت ہوئے۔

معلوم ہوا کہ موصوف علی بن ہبۃ اللہ، مصری ہیں، لیکن اس کے باوجود حافظ سیوطی نے انھیں حسن المحاضرة میں ذکر نہیں کیا۔ بہر حال شیخ کا جو بھی حال ہو، وہ ابو صادق مدینی سے کتاب روایت کرنے میں منفرد نہیں ہے...... (ازاں بعد ابو القاسم ہبۃ اللہ بن علی بن مسعود بن ثابت البوصیری کی متابعت ذکر کی اور لکھا:) یہ علی بن ہبۃ اللہ المصري (ابوالحسن) کے لیے ان کے ہم شہر ہبۃ اللہ بن علی البوصیری ابو القاسم کی مضبوط متابعت ہے۔ وہ معروف شیخ تھے۔ اواخر عمر میں محدث دیارِ مصر تھے۔ اُنھوں نے قاہرہ اور اسکندریہ میں درسِ حدیث کی مجلس سجائی۔ ۵۹۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

## (سندِ کتاب کے بارے میں شیخ البانی کا منہج)

اس کے باوجود علماء کے ہاں کتاب کی شہرت، ان کا اس سے استفادہ اور اعتماد کرنا اس کی استنادی حیثیت سے بحث کرنے میں کفایت کر جاتا ہے۔ اگر سند صحیح ہو تو اس کی صحتِ نسبت دو چند ہو جاتی ہے، بہ صورت دیگر اسے نقصان نہیں۔ بنابریں جس نے بھی اس موضوع (الصلاة علی النبي ﷺ) پر لکھا، اس نے اسے مصادرِ اُولیٰ میں ذکر کیا ہے، اگرچہ اسے سب سے مقدم نہیں کیا، جیسا کہ علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب "جلاء الأفهام"، حافظ سخاوی نے القول البدیع اور ان کے علاوہ دیگر مولفین نے بھی ذکر کیا ہے۔" (مقدمہ تحقیق فضل الصلاة علی النبي ﷺ للألباني، ص: و، ز، ح)

علی بن ہبۃ اللہ کے بارے میں درج ذیل کتابیں دیکھیے:

(تاریخ الإسلام للذهبي، ص: ۳۳۳: (حوادث: ۵۷۱ تا ۵۸۰ھ)، المشتبہ في الرجال للذهبي: ۲/ ۵۴۰، توضیح المشتبہ لابن ناصر الدین: ۷/ ۲۶۹، تبصیر المنتبہ لابن حجر: ۳/ ۱۲۰۳،

تاج العروس للزبيدي: ۸/۱۰۴، مادہ: کمل)

اس لیے حدیثی قواعد کے مطابق علی بن ہبۃ اللہ صدوق نہیں ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ فضل الصلاۃ کی دوسری سند سے اگر کتاب ثابت ہوسکتی ہے تو العلل الکبیر کیوں نہیں ہوسکتی! حالانکہ اس کی بھی دوسری سند موجود ہے۔ یہ اُصولِ مولانا مرحوم، ابو حامد التاجر کی غیر صریح توثیق بھی ثابت ہو چکی ہے۔ اور العلل الکبیر بھی حسن لذاته کے درجے میں پہنچ چکی ہے!

یہاں یہ اعتراض بھی وارد ہوسکتا ہے کہ کتاب کی صحتِ سند کی بابت شیخ البانی کا مذکورہ بالا موقف نہایت قدیم ہے جو اُنھوں نے ۱۹۶۳ء میں اختیار کیا۔ ۲۰۰۲ء میں اُنھوں نے ضعفِ سند کی بنا پر کتاب الجهاد لعبد الله بن المبارك کا انکار کیا ہے۔

(الصحيحة: ۷/ ۲، رقم: ۱۰۳٤)

اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ البانی نے فضل الصلاۃ کے مقدمے میں جو موقف اپنایا ہے آخری وقت تک وہ اسی پر کاربند رہے، جیسا کہ ان کا اسلوب اس کی تائید کرتا ہے۔

ثانیاً: ضعف کی دو صورتیں ہیں: (۱) راوی یا رواۃ کا ترجمہ نہ ملنا۔ (۲) راوی یا راویان کا مجروح ہونا۔

صورتِ اول میں ضعف قابلِ برداشت ہے۔ صورتِ دوم میں تفصیل ہے: اگر ضعف شدید ہے، مثلاً: راوی کذاب یا وضاع ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کی نقل کردہ کتاب غیر معتبر ہوگی۔ اگر ضعیف ہے مگر روایتِ کتاب کے بارے میں علمائے کرام نے اس کے اہتمام کی گواہی دی ہے تو یقیناً اس کی کتاب معتبر ہوگی۔ اس حوالے سے مزید گفتگو آئندہ "كتاب الجهاد لعبد الله بن المبارك" کے زیرِ عنوان آرہی ہے۔ (جاری ہے)

## سید عبدالحنان شاہ صاحب کا انتقال پر ملال

مولانا سید عبدالحنان شاہ صاحب (جامعہ سلفیہ دعوۃ الحق کوئٹہ و ڈائریکٹر جمعیۃ الہدیٰ الخیریۃ پاکستان) طویل علالت کے بعد ۶ فروری ۲۰۱۶ء ہفتہ کی رات وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم گوناگوں صفات کے حامل، دینی، سماجی، فلاحی اور خدمتِ خلق کے اداروں کے روحِ رواں اور ہمہ جہت شخصیت تھے۔

کوئٹہ بلوچستان میں اُنھوں نے جامعہ سلفیہ دعوت الحق اور جمعیت الہدیٰ الخیریہ کے تحت بڑی خدمات سرانجام دیں۔ روس کے خلاف جہادی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ رفاہِ عامہ کے تحت ہسپتال قائم کیا اور اسی طرح عوام الناس کی فلاح و بہبود کے کئی ایک منصوبوں پر ان کی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ ہیپاٹائٹس اور کینسر جیسے عوارض انھیں لاحق ہو گئے تھے۔ کوئٹہ سے لاہور کچھ عرصے سے یہ مقیم تھے۔ یہاں بھی دعوتی وتبلیغی اور رفاہی سرگرمیوں میں مگن تھے۔ اُنھوں نے پسماندگان میں دو بڑے بیٹے اسد الرحمان اور عبدالرحمان صاحبان یہ دونوں مدینہ یونیورسٹی سعودی عرب میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور چھوٹے بچے جو ابھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں چھوڑے ہیں۔

ان کی نماز جنازہ سبزہ زار سکیم بلاک جی کی گراؤنڈ میں ۷ فروری بروز اتوار صبح ۱۱ بجے حافظ مسعود عالم صاحب نے پڑھائی۔ نماز جنازہ میں مولانا قاری محمد عزیر، مولانا مبشر احمد مدنی، حافظ احمد شاکر، حافظ حماد شاکر، حافظ خلاد شاکر، محمد سلیم چنیوٹی، میاں محمد جمیل، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، قاری محمد ابراہیم میر محمدی، مولانا عتیق اللہ سلفی (ستیانہ بنگلہ) حافظ عبدالحمید عامر (جہلم) سید محمد یحییٰ شاہ، ڈاکٹر عبدالغفور راشد، سیف اللہ خالد، مولانا محمد یونس بٹ، مولانا نجیب اللہ طارق، مولانا سعید احمد چنیوٹی، رانا نصر اللہ خان، حافظ عبدالشکور مدنی، شفیق الرحمان فرخ سمیت سیکڑوں علمائے کرام وطلباء شریک ہوئے۔

احباب وقارئین سے مرحوم کی مغفرت و بلندی درجات کے لیے دعاؤں کی درخواست ہے۔ (ادارہ)

# سندِ کتاب میں منہجی غلطی کا جائزہ

محمد خبیب احمد (ادارہ علوم اثریہ، فیصل آباد)

## اعتراضات کا جائزہ

### العللِ الکبیر کے انکار کا سبب:

راقم الحروف نے متقدمین محدثین سے قلت اور کثرتِ تدلیس کے اثبات کے لیے مولانا زبیر علی زئی مرحوم کے سامنے امام بخاری کا قول پیش کیا، جس میں اُنھوں نے امام سفیان ثوری کو قلیل التدلیس بلکہ نہایت کم ترین تدلیس کرنے والا قرار دیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"ما أقل تدليسه!" (ان کی تدلیس کتنی کم ہے!)

اس قول کا بنیادی مرجع امام ترمذی کی کتاب العلل الکبیر تھی۔ مولانا نے دو مقاصد کی تکمیل کے لیے اس کتاب کا انکار کرنے ہی میں بہتری سمجھی؛ پہلا مقصد یہ تھا کہ امام بخاری سے صراحتاً قلّت اور کثرتِ تدلیس کا ثبوت مہیا نہ ہو سکے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ امام ثوری کو بالصراحت قلیل التدلیس مدلس ثابت نہ کیا جائے۔

حالانکہ انھیں چاہیے تھا کہ وہ اپنے استقرا کو امام بخاری کے استقرائے تام سے مستحکم قرار دیتے ہوئے إمام العلل کی تغلیط کر دیتے، جیسا کہ اُنھوں نے صاحبِ استقرائے تام حافظ ذہبی کا امام زہری کے بارے میں قول: ''زہری نہایت کم تدلیس کرتے تھے'' کی تغلیط کرتے ہوئے کہا:

''وہ انوکھے اقوال میں سے ہے جس پر متقدمین کی کوئی راہنمائی نہیں ہے۔'' (الفتح المبین، ص:۱۲۱ طبع جدید)

اس پر تبصرہ کسی اور مقام پر آئے گا۔ مگر کتاب کا انکار اس کی بہت سی نصوص کو سبوتاژ کرنے کی سعیِ نامشکور اور منہجِ محدثین سے انحراف ہے۔

مولانا مرحوم اس کتاب کی صحت نسبت میں خاصے مضطرب رہے۔ اُنھوں نے اس کتاب کا بالصراحت انکار فروری ۲۰۱۳ء میں کیا۔ (ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۰۲، ص: ۲۸) پھر نومبر ۲۰۱۳ء میں اسی کو دہرایا۔ (تحقیقی مقالات: ۶/ ۵۸۸۔ سن طبع: ۲۰۱۳ء)

جولائی ۲۰۰۷ء میں ان پر راویِ کتاب کی جہالت واضح ہو چکی تھی جس کا اظہار اُنھوں نے اپنے موقر جریدے میں کیا ہے۔ (ماہ نامہ الحدیث، شمارہ: ۳۸، ص: ۳۱۔ جولائی ۲۰۰۷ء، نیز ملاحظہ ہو مقالات: ۱/ ۴۰۴، ۴۰۵) بنا بریں اُنھوں نے لکھا کہ یہ کتاب امام ترمذی کی طرف منسوب ہے۔ (فتاویٰ علمیہ: ۲/ ۱۷۷)

اس کے باوجود اس دورانیے (جولائی ۲۰۰۷ء تا نومبر ۲۰۱۳ء، تقریباً سوا چھ سال) میں وہ اس کتاب کی بعض اسانید و اقوال کو صحیح کہتے رہے۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆......"وإسناده صحيح ." (مقالات: ۱/ ۲۷۵)

☆......"وسنده صحيح ." (تحقیقی مقالات: ۱/ ۲۷۶)

☆......"وسنده صحيح ." (مقالات: ۱/ ۲۸۷)

حالانکہ آپ ابھی پڑھ آئے ہیں کہ اُنھوں نے اسی کتاب (تحقیقی مقالات، ص: ۴۰۴، ۴۰۵) میں العلل الکبیر کو ترمذی کی طرف منسوب کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب کتاب ہی ثابت نہیں، اس میں موجود اقوال کیسے ثابت ہو گئے! خشتِ اول ہی جب موجود نہیں تو اس پر بنیاد رکھنے کا تصور کیسا ہے!

عجب تو یہ کہ اُنھوں نے المکتبة الشاملة سے مطبوع کتاب کے حوالے کے ساتھ ساتھ مخطوط کا حوالہ یوں ذکر کیا:

”ترتيب علل الترمذي: ١/ ٨، ورقة:٥ .“
(تحقیقی مقالات:٣/٢٠٦)

غیر ثابت شدہ کتاب کے مخطوط کا ذکر، چہ معنی دارد!

نیز درج ذیل مقامات پر العلل الکبیر کا حوالہ دینے کے بعد ”سنده صحيح“ لکھنے کا کیا جواز!

☆......(تحقیقی مقالات:٣/ ٢٢٧، ٣١٠، ٥٦٣)

☆......”وسنده صحيح .“ (فتاویٰ علمیہ:١/ ٣٢٨۔سن طباعت:اکتوبر ٢٠٠٩ء)

☆......”وسنده صحيح .“(فتاویٰ علمیہ:٢/ ٣٢٣۔سن طباعت: مارچ ٢٠١٠ء)

حالانکہ اسی کتاب کے صفحہ: ١٧٧ پر اسے امام ترمذی کی طرف منسوب ہونے کا دعویٰ کر چکے ہیں!

☆......”وسنده صحيح .“(نور العينين ،ص:٣٨١۔ سن طباعت:اکتوبر ٢٠١٢ء)

متعدد مقامات پر اُنھوں نے محض کتاب کا حوالہ دینے پر اکتفا کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

- تحقیقی مقالات:١/ ٢٦٥، ٢٨٦۔
- تحقیقی مقالات:٣/ ٨٥۔
- فتاویٰ علمیہ:٢/ ٤١٧، ٤١٨، قول نمبر:٤١٢، ٤١٤، ٥١٤۔
- صحیح بخاری پر اعتراضات کا علمی جائزہ (ضمن صحیح بخاری کا دفاع)،ص:٣٣٧۔
- نماز میں ہاتھ باندھنے کا حکم اور مقام،ص:١٠۔
- ”بخاری۔(سنن الترمذی:٣١٩٥، ٣١، ٢٧ وعلل الترمذی الکبیر:١/ ٥١٢)۔“(أضواء المصابيح:١/ ٦٥)

یعنی امام بخاری کی ذکر کردہ راوی کی عدالت کو امام ترمذی نے اپنی دو کتابوں میں بیان کیا ہے۔

قارئین کرام! آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ مولانا مرحوم راویِ کتاب کی جہالت واضح ہونے کے بعد بھی خاصے پریشان رہے، حالانکہ ابو حامد التاجر کی جہالت پر وہ ٢٠٠٧ء میں مطلع ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود وہ منہجِ محدثین پر چلتے رہے۔اور ٢٠١٣ء میں اہلِ فن کی شاہراہ کو چھوڑ کر شذوذ کی پگڈنڈی پر گامزن ہو گئے! رحمه الله تعالى .

مولانا رقم طراز ہیں:

”کتاب سے روایت جائز ہے، الا یہ کہ اصل کتاب میں طعن ثابت ہو تو پھر جائز نہیں۔“(نور العينين، ص:٤٨٥)

سوال ہے کہ جب ان کے نزدیک کتاب میں طعن ثابت ہے تو پھر اس کی احادیث کو صحیح قرار دینے کا جواز کہاں سے نکل آیا؟

پھر یہ بھی دیکھیے کہ راقم الحروف امام بخاری کا قول نقل کرنے یا اس سے استدلال کرنے میں تنہا نہیں بلکہ تیئیس (٢٣) علماء اور محدثین کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ہفت روزہ الاعتصام، لاہور: جلد: ٦٧، شمارہ: ٢٥، ص:٢٢۔ جون ٢٠١٥ء)

ملحوظ رہے کہ شیخ کی اُصولی و منہجی غلطیوں کے علاوہ جزوی اغلاط بھی موجود ہیں بلکہ وہ تناقض کا بھی شکار ہو جاتے ہیں!

## عجیب تناقض:

العلل الکبیر میں مذکور امام بخاری کے قول کا مقصد یہ ہے کہ سفیان ثوری تین نام زد اور دیگر بہت سے شیوخ سے تدلیس نہیں کرتے، یعنی ان سے امام ثوری کی معنعن روایت قابلِ احتجاج ہے۔وہ تین شیوخ حسب ذیل ہیں:

(١)۔حبیب بن ابی ثابت، (٢)۔سلمہ بن کہیل، (٣) منصور۔

مولانا مرحوم امام بخاری کے اس قول کے انطباق میں خاصے متذبذب ہیں، چنانچہ وہ ثوري عن سلمة کے بارے میں لکھتے ہیں:

①......”وحديث سفيان الثوري عن سلمة صحيح .“(أنوار الصحيفة في الأحاديث الضعيفة من السنن الأربعة ، ص: ١٩٦ .

ضعیف سنن الترمذي، حدیث: ۲٤۸. نیچے سے اوپر دوسری سطر)

''سفیان ثوری کی سلمہ سے (معنعن) حدیث صحیح ہے۔''

② ...... ''امام سفیان ثوری کی سلمہ بن کہیل سے روایت قوی ہوتی ہے، لہٰذا یہ سند حسن لذاتہ ہے۔''

(تحقیقی مقالات: ۵/۵۵۴)

③ ...... ''یعنی سفیان ثوری، سلمہ بن کہیل سے تدلیس نہیں کرتے تھے۔'' (فتاویٰ علمیہ: ۱/ ۳۳۶)

④ ...... ''سفیان کی سلمہ بن کہیل سے روایت سماع پر محمول ہوتی ہے۔ (دیکھیے نور العینین، ص: ۱۲۸، طبع قدیم، ص: ۱۰۳، العلل الکبیر للترمذي: ۲/۹۶۶، التمهید: ۱/۳۴)۔'' (نصر الباري في تحقیق جزء القراءة للبخاري، ص: ۲۵۶)

⑤ ...... ''امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ آپ سلمہ بن کہیل سے تدلیس نہیں کرتے تھے۔'' (القول المتین في الجهر بالتأمین، ص: ۲۴۔ سن طباعت: جنوری ۲۰۰۴ء)

ان پانچ حوالوں سے ثابت ہوا سفیان ثوری کی سلمہ بن کہیل سے معنعن روایت مولانا مرحوم کے نزدیک سماع پر محمول ہوتی ہے۔ بنابریں اُنھوں نے ایک حدیث کو حسن لذاتہ بھی کہا ہے۔ مگر یہ دیکھیے کہ أنوار الصحیفة کے صفحہ: ۱۹۶ پر تو روایت ''سألت أبي بن کعب عن النبیذ'' کے بارے میں یوں حکم لگاتے ہیں:

''إسناده ضعیف. سفیان الثوري عنعن.''

(أنوار الصحیفة، ص: ۳٦۹، ضعیف سنن النسائي، رقم: ۵۷۵۷)

اسی کتاب میں دوسرے مقام پر روایت ''إذا رمی الجمرة...... إلخ.'' کے تحت لکھتے ہیں:

''إسناده ضعیف. الحسن العرني ثقة، أرسل عن ابن عباس فالسند منقطع والثوري عنعن.'' (أنوار الصحیفة، ص: ۳٤٤، ضعیف سنن النسائي، رقم: ۳۰۸٦)

''اس کی سند ضعیف ہے۔ حسن عرنی ثقہ ہیں اور وہ ابن عباس سے مرسل (منقطع) بیان کرتے ہیں، لہٰذا سند منقطع ہے۔ ثوری بھی معنعن بیان کر رہے ہیں۔''

گویا اس سند میں دو علتیں ہیں: انقطاع اور ثوری کا عنعنہ۔

اب سنن نسائی اُٹھائیے اور دیکھیے، محولا بالا دونوں مقامات پر ثوری، سلمہ بن کہیل سے بیان کرتے ہیں۔ مولانا کے اپنے اُصول کے مطابق پہلی روایت صحیح قرار پاتی ہے، لہٰذا اس کی بابت ''إسناده ضعیف'' کہنا تناقض ہے۔

دوسری روایت میں بھی ان کے اُصول کے مطابق ایک وجۂ ضعف ہے اور وہ انقطاع ہے۔ یہ بات عام طالب علم کو بھی معلوم ہے کہ دو اسبابِ ضعف والی حدیث ایک سببِ ضعف والی حدیث سے زیادہ کمزور ہوتی ہے، گویا شیخ نے اسے شدید ضعف میں دھکیل دیا ہے!

أنوار الصحیفة کے تین مقامات (ص: ۱۹۶، ۳۴۴، ۳۶۹) قارئین کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، پہلی جگہ مولانا مرحوم ثوری کے عنعنہ کا دفاع کر رہے ہیں اور دوسرے دو مقامات پر تضعیف کر رہے ہیں! مولانا کا کون سا موقف آخر درست ہے؟

**تناقض کی دوسری مثال:**

مولانا زبیر علی زئی رحمہ اللہ امام بخاری کے قول کے تناظر میں لکھتے ہیں:

''سفیان ثوری درج ذیل شیوخ سے تدلیس نہیں کرتے تھے: حبیب بن ابی ثابت، سلمہ بن کہیل اور منصور (وغیرہم)۔ (العلل الکبیر للترمذي: ۲/۹۶۶، التمهید لابن عبدالبر: ۱/۳۴، شرح علل الترمذي: ۲/۷۵۱)۔''

(نور العینین، ص: ۱۳۸۔ طبع جدید: اکتوبر ۲۰۱۲ء)

اس کے برعکس اُنھوں نے تین روایات میں ایک وجۂ ضعف سفیان عن حبیب بن أبي ثابت کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

❶......"الثوري و حبيب عنعنا." (أنوار الصحيفة، ص: ١٢٦، ضعيف سنن أبي داود، رقم: ٣٥٥٧)

❷......"سفيان الثوري و حبيب عنعنا." (أنوار الصحيفة، ص: ١٤٠، ضعيف سنن أبي داود، رقم: ٣٩١٩)

❸......"حبيب و تلميذه سفيان الثوري مدلسان وعنعنا، و السند منقطع. وأشار مسلم في مقدمة صحيحه إلى ضعفه." (أنوار الصحيفة، ص: ١٦٨، ضعيف سنن أبي داود، رقم: ٤٨٤٢)

''حبیب اوران کے شاگرد سفیان ثوری دونوں مدلس ہیں اوراُنھوں نے روایت معنعن بیان کی ہے۔سند منقطع ہے۔امام مسلم نے صحیح مسلم کے مقدمے میں اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔''

نور العینین میں ذکرکردہ مولانا مرحوم کے موقف کے مطابق مذکورہ بالا ان تینوں حدیثوں میں ایک سببِ ضعف ہے۔سوال ہے کہ ان کا نور العینین والاموقف درست ہے یاأنوار الصحیفة والا؟ اور یہ کہ ایسا اندازِ تحقیق کیا تاثر دے رہا ہے، اس کا فیصلہ ہم قارئین پرچھوڑتے ہیں۔

ممکن ہے کوئی وکیلِ صفائی یہ جواب دے کہ مولانا مرحوم امام بخاری کے قول تو کیا، جس کتاب میں وہ مذکور ہے اسی کا انکار کر چکے ہیں،لہٰذا اب انھیں الزام دینے کا کیا فائدہ،تحقیقات تو بدلتی رہتی ہیں!

عرض ہے کہ یہ تناقض اس وقت کا ہے جب شیخ العلل الکبیر کومعتبر اورامام بخاری کے قول کومستند مانتے تھے۔آپ پڑھ آئے ہیں کہ فروری ۲۰۱۳ء میں اُنھوں نے سب سے پہلے بالصراحت اس کا انکار کیا۔اورنور العینین اکتوبر۲۰۱۲ء میں جب کہ أنوار الصحیفة ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی۔

## امام البانی کی ناقص ترجمانی:

راقم الحروف کوامام سفیان ثوری کی وہ روایات دیکھنے کا موقع ملا جنھیں شیخِ مکرم نے ثوری کے عنعنہ کی وجہ سے ضعیف قراردیا۔تو نظروں سے درج ذیل روایت بھی گزری:

"إن اللّٰه ملائكته يصلون على ميامن الصفوف."

''اللہ اوراس کے فرشتے صفوں کی داہنی جانب پر درود بھیجتے ہیں۔''

مولانا نے اس پر یوں حکم لگایا:

"إسناده ضعيف، سفيان الثوري عنعن." (أنوار الصحيفة، ص: ٣٧، ضعيف سنن أبي داود، رقم: ٦٧٦)

اس کے شروع میں گول دائرہ ''O'' بہ طورِ علامت ذکر کیا ہے جس کا مطلب ہے کہ شیخ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہےاور میرے (مولانا زبیر مرحوم) کے نزدیک اس کا ضعف راجح ہے۔جیسا کہ اُنھوں نے مقدمۂ کتاب میں صراحت کی ہے۔(أنوار الصحیفة ،ص:۹)

ان کے ذکرکردہ اس رمز سے قارئین کو یہ تصور ملتا ہے کہ ''على ميامن الصفوف ''کے الفاظ کوشیخ البانی نے صحیح قرار دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ وہ بھی مولانا مرحوم کی طرح "الذين يصلون الصفوف" (جوصفیں درست کرتے ہیں) کے الفاظ کوصحیح کہتے ہیں۔ان کے نزدیک ''میامن'' کے الفاظ غیر محفوظ، خطا،ضعیف اورمعاویہ بن ہشام کا تفرد ہیں۔(ملاحظہ ہو الصحيحة: ٥/ ٣٧٤، تحت حديث: ٢٢٣٤، الضعيفة:

١٢/ ١/ ٤٢٨، تحت، حديث: ٥٦٨٦، صحيح سنن أبي داود: ٣/ ٢٥٥، حديث: ٦٨٠، ضعيف أبي داود: ٩/ ٢٣٢، حديث: ١٠٤، مشكاة المصابيح: ١/ ٣٤٢، حديث: ١٠٩٦، ضعيف الجامع الصغير: ٢/ ١٠٦، حديث: ١٦٦٨، تمام المنة، ص: ٢٨٨، ضعيف ابن ماجه بإهتمام الشاويش، ص: ٢٠٩، حديث: ١٠٠٥، ضعيف سنن أبي داود بإهتمامه، ص: ٦٣، حديث: ٦٧٦)

ملحوظ رہے کہ شیخ زہیر شاویش کے اہتمام سے شائع شدہ ضعیف سنن اربعہ سے شیخ البانی اظہارِ براءت کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو الصحیحۃ: ٧/ ١/ ٤١، ٦١٧، الضعیفۃ: ١٣/ ١/ ٦٢)

تحدیثِ نعمت کے طور پر یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مولانا زبیر نور اللہ مرقدہ ہمارے ادارے میں تشریف لائے، ضعیف سنن اربعہ پر گفتگو چھڑ گئی۔ اُنھوں نے فرمایا: میں نے شیخ البانی کی تحقیقات کو سامنے رکھ کر سنن اربعہ پر ان سے اختلافی نوٹ لکھا ہے۔ راقم نے سوال کیا کہ شیخ البانی کی ان کتب کو ملحوظ رکھا ہے جو شیخ زہیر شاویش کی تحقیق و اِشراف سے شائع ہوئی ہیں؟ اُنھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ کیوں کہ اس وقت یہی نسخے متداول تھے۔ شیخ ابوعبیدہ مشہور بن حسن آل سلمان کے اہتمام سے شیخ البانی کا کام بہت بعد منظرِ عام پر آیا۔ میں نے عرض کیا کہ شیخ البانی شیخ زہیر شاویش کی طباعت سے براءت کا اعلان کر چکے ہیں۔ پوچھنے لگے: وہ کیسے؟ تو راقم الحروف نے الصحیحۃ اور الضعیفۃ کے متذکرہ بالا حوالے نکال کر دکھائے تو وہ استعجاب میں ڈوب گئے۔

یہاں بھی شیخ مکرم کو صراحت کرنی چاہیے تھی کہ شیخ البانی نے ''علی میامن الصفوف'' کے الفاظ کو قطعاً صحیح نہیں کہا۔

### صحتِ نسبت کے لیے محض سند کسوٹی نہیں:

مولانا ندیم ظہیر رقم طراز ہیں:

''جب بھی علماء نے کسی کتاب کو غیر ثابت قرار دیا، ہمیشہ سند ہی کی بنیاد پر دیا ہے۔ یہ کون سا اُصول ہے کہ جب کتاب کو غیر ثابت کہنا مقصود ہو تو سند پر بحث کر دی جائے اور جب اسے قبول کرنا ہو تو سند کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا جائے۔'' (ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث: شمارہ: ١٢٩۔١٣٢، ص: ١٣٢۔ مئی تا اگست ٢٠١٥ء)

بلاشبہ نسبتِ کتاب کے لیے صحتِ سند ضروری ہے۔ اگر سند مفقود ہو یا اس میں کوئی راوی ضعیف ہو تو پھر تعاملِ محدثین کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اگر محدثین اسے قبول کریں اور خارجی قرائن سے اس کی تردید نہ ہو تو ایسی کتاب قابلِ اعتبار ہوگی۔ گویا کتاب پرکھنے کی یہ دوسری کسوٹی ہے۔ جس کتاب کی سند صحیح ہو اور محدثین بھی اس سے نقل کریں بلکہ علمائے کرام کے مسموعات بھی اس پر موجود ہوں تو وہ یقیناً صحت کے اعتبار سے اعلیٰ ترین درجے میں ہوگی۔ اگر سند ضعیف ہو تو اس کا رتبہ نسبتاً کم ہو جائے گا۔ یہ نہیں کہ وہ کتاب ہی درجۂ صحت سے نکل کر غیر معتبر کے دائرے میں آجائے گی، جیسا کہ موصوف باور کرا رہے ہیں۔

باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ ''یہ کون سا اُصول ہے کہ جب کتاب کو ......الخ'' تو اس حوالے سے چند سوالات کھٹک رہے ہیں:

(١) مولانا زبیر نے عدمِ سند کے باوجود غنیۃ الطالبین کو شیخ عبدالقادر جیلانی کی تصنیف کیوں قرار دیا؟

جو ''اُصول'' ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں، اس کی خلاف ورزی آپ کے شیخ و استاد نے کیوں کی ہے؟

(٢) الضعفاء الصغیر للبخاري کی تحقیق مولانا مرحوم نے ''تحفۃ الاقویاء'' کے نام سے کی ہے۔ اس کتاب کے ایک راوی کا ترجمہ انھیں نہیں ملا۔ اس کے باوجود اُنھوں نے اسے امام بخاری کی طرف کیوں منسوب کیا؟ ضعیف کتاب کی تحقیق کیوں کی؟

(۳) جزء الحمیري حدیث کا چھوٹا سا جز ہے، اس کی تحقیق بھی شیخ کے قلم سے منصۂ شہود پر آچکی ہے۔ اس کے ناسخ کا ثقہ وصدوق ہونا وہ بھی ثابت نہ کر سکے بلکہ اس کے بدعتی، رافضی اور معتزلی ہونے کو تسلیم کرنے کے باوجود اس جزء کو امام حمیری کی طرف کیوں منسوب کیا؟

(۴) اُصولِ دین از ابن ابی حاتم ترجمہ وتحقیق کے ساتھ مولانا مرحوم نے پیش کی۔ اس کے ایک راوی کی عدمِ توثیق کے باوجود اس رسالے کو امام ابن ابی حاتم کی طرف کیوں منسوب کیا؟ (یہ عربی رسالہ "أصل السنة و اعتقاد الدین" کے نام سے علامہ الشیخ عُزیر شمس حفظہ اللہ نے روائع التراث کے مجموعے میں شاملِ اشاعت کیا ہے)

جواب واضح ہے کہ انھیں قبول کرنا مقصود تھا، تبھی سند کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور جب رد کرنے کی نوبت آئی تو العلل الکبیر میں راوی کی جہالت ڈھونڈھ لی۔ تلك إذا قسمة ضیزی!

نیز مولانا مرحوم نے جن جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، اُنھوں نے ان سب کی اسانید کا جائزہ لیا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو تاریخ الغرباء لابن یونس المصري، الأدب المفرد للبخاري، السنة لعبداللہ بن الإمام أحمد، علل الدارقطني، سؤالات أبي داود للإمام أحمد بن حنبل، الرسالة إلى أهل مكة لأبي داود السجستاني، الإقناع لابن المنذر کی استنادی حیثیت ان پر کیوں مخفی رہ گئی؟

اگر جواب نفی میں ہو تو اس کا مطلب ہے کہ مولانا مرحوم محدثین کے ہاں قابلِ اعتبار کتب کو قابلِ قبول سمجھتے تھے، اگرچہ ان کی اسانید میں کمزوری ہو یا سرے سے موجود نہ ہوں۔

شیخ مکرم کی خدمات کا یہ ناچیز قدردان ہے۔ سنن اربعہ کی تحقیق ان کا عظیم شاہکار ہے۔ سوال یہ ہے کہ سنن ابی داود، جامع ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کی تحقیق میں جو نسخے ان کے پیشِ نظر تھے، کیا وہ ناسخین سے لے کر مصنفین تک بہ سندِ صحیح تھے؟ یا ان پر سند ہی موجود نہیں تھی؟ مولانا عموماً دار السلام (الریاض) کے مطبوعہ نسخوں کے حوالے دیتے تھے۔ جنھیں اربابِ ادارہ نے متداول نسخوں کو بنیاد بنا کر شائع کیا ہے، چنانچہ آپ ان کتب کے شروع میں "کلمة الناشر" کے عنوان کے تحت دیکھ سکتے ہیں۔ صحتِ سند اور متصل سندِ کتاب کا قانون کہاں گیا؟ یا ان کتب کی شہرت ہی تقاضۂ سند سے کفایت کرتی ہے؟

## العلل الکبیر کا مسندِ زید سے تقابل!

ندیم صاحب لکھتے ہیں:

> "مولانا ارشاد الحق اثری علیہ السلام مسند امام زید کی سند پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حضرت زید سے اس سند کا راوی تنہا عمرو بن خالد الواسطی ہے اور وہی محدثین کرام کے نزدیک بالاتفاق کذاب اور وضاع ہے۔ کوئی قابلِ اعتبار قول اس کی توثیق میں منقول نہیں۔ (مقالات، جلد دوم، ص: ۷۵)۔"

(ماہنامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۲، ۱۳۳)

ندیم صاحب نے یہاں اپنا روایتی ہتھیار استعمال کیا اور تاثر یہ دیا ہے کہ مولانا اثری نے محض سند کو بنیاد بنا کر مسندِ زید کو غلط منسوب قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ حقیقت سے کوسوں دور ہے۔

مولانا زبیر مرحوم نے بھی زیادة الثقہ کے مسئلے میں راقم الحروف کے خلاف یہ دلیل پیش کی کہ "اثری صاحب کے نزدیک قولِ راجح میں متنِ حدیث میں ثقہ راوی کی زیادت مقبول ہے"، جس کی قلعی بحمد اللہ ہم نے کھول دی۔ (ملاحظہ ہو مقالات اثریہ، ص: ۴۶۵) یہاں بھی اسی روایت کا تسلسل ہے اور باور کرایا جا رہا ہے کہ مولانا اثری نے کتاب کو پرکھنے کے لیے صرف سند کو کسوٹی قرار دیا ہے۔ اس کی حقیقت بھی ملاحظہ کر لیجیے:

## مولانا اثری کا سند کے ساتھ دیگر قرائن کا اعتبار کرنا:

ندیم صاحب نے سند سے متعلق مولانا ارشاد الحق اثری کا تبصرہ ذکر کر دیا اور دیگر قرائن جو اُنھوں نے ذکر کیے ہیں انھیں نظر انداز کر دیا، حالانکہ مولانا اثری لکھتے ہیں:

''مسند امام زید، جس کا نام المجموع العلمي اور "المجموع الكبير في الفقه" بھی کہا گیا ہے، کا انتساب امام زید کی طرف محلِ نظر ہے۔ استاد محمد عجاج الخطیب اپنی معرکہ آراء کتاب السنة قبل التدوين میں لکھتے ہیں:

''ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہم اس المجموع کو اسی جمع وترتیب کے ساتھ قطعی طور پر امام زید کی تصنیف قرار دیں۔''

(۲) اسی طرح ماضی قریب کے نامور مصری محدث استاد احمد محمد شاکر نے واشگاف الفاظ میں کہا ہے کہ مسندِ زید یا المجموع الفقهي نامی کتاب مجموعۂ اکاذیب ہے۔ ہمارے بعض ازہری شیوخ کی تقریظات وتوقیعات کی اس کے بارے میں کوئی حیثیت نہیں۔ صحیح وضعیف کو وہ جانتے ہی نہیں۔ (ملاحظہ ہو التعليق على المحلى: ۲/ ۷۵)

(۳) اس کتاب کی بعض روایات ایسی ہیں جنھیں امامیہ اپنے امام باقر سے بہ واسطہ عن أبيه عن جده حضرت علی سے اس کے برعکس نقل کرتے ہیں، چنانچہ شیخ احمد امین مصری لکھتے ہیں:

"بعض ماروي في هذا الكتاب عن زيد عن أبيه عن جده عن علي يخالف ما يرويه الإمامية عن الإمام الباقر عن أبيه عن جده عن علي." (ضحى الإسلام: ۲/ ۲۷۶)

بنا بریں خود زیدیہ اور امامیہ کے مابین اس کی بعض روایات کے بارے میں اختلاف ہے۔ زیدیہ اپنے امام کی مرویات کو ترجیح دیتے ہیں اور امامیہ اپنے امام کی مرویات کو۔

(۴) حضرت زید سے اس سند کا راوی تنہا عمرو بن خالد الواسطی ہے اور وہی محدثین کرام کے نزدیک بالاتفاق کذاب اور وضاع ہے۔ کوئی قابلِ اعتبار قول اس کی توثیق میں منقول نہیں......

(۵) خالد کے علاوہ عبدالعزیز بن اسحاق بن بقال، جسے اس کتاب کا جامع قرار دیا گیا ہے، وہ غالی شیعہ اور ضعیف ہے ......اس کے خبثِ باطن کا نتیجہ ہے کہ اس نے کوئی روایت حضرت علی کے علاوہ کسی اور صحابی سے نقل نہیں کی......

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس مسند کا مرکزی راوی کذاب، وضاع اور حضرت زید سے عن أبيه عن جده کے واسطے سے جھوٹی روایتیں گھڑنے والا ہے۔

(۲) اس کا جامع بھی ضعیف اور شیعہ۔

(۳) اس کی روایات شیعہ فکر کی آئینہ دار ہیں۔

(۴) دیگر روایات سے بھی اس کا بطلان ثابت ہے۔

(۵) اور اہلِ علم نے اسے غیر مستند قرار دیا ہے۔''

(مقالات از مولانا ارشاد الحق اثری: ۲/ ۷۴، ۷۵، ۷۷)

یعنی اُنھوں نے اس مسند کے غیر معتبر ہونے کے پانچ دلائل ذکر کیے ہیں۔ محض سند کی وجہ سے اسے غیر معتبر قرار نہیں دیا۔ جیسا کہ ہمارے مہربان ایسا باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سوال ہے کہ

(۱) العلل الكبير کو کس نے گھڑ کر امام ترمذی کی طرف منسوب کیا؟

(۲) اس کا کون سا راوی شیعہ ہے؟ نیز جزء الحميري کے ناسخ کے بدعتی، رافضی اور معتزلی ہونے کے باوجود وہ کتاب امام الحمیری کی طرف کیسے منسوب کی جا سکتی ہے؟

(۳) کیا دیگر روایات سے العلل الكبير کا بطلان ثابت ہو سکتا ہے؟

(۴) کون سے اہلِ علم ہیں جنھوں نے العلل الکبیر کا انکار کیا ہے؟ آخر وہ کیوں خاموش رہے؟

(۵) مخطوط پر "علل الترمذی الکبیر" کا مرقوم ہونا غلط ہے؟ مسندِ زید کا انکار تنہا مولانا اثری نے نہیں کیا بلکہ دیگر علماء نے بھی اسے غلط قرار دیا ہے، مثلاً:

(۱) حافظ ابن حزم۔ (المحلی:۲/۷۵)

(۲) محدثِ مصر شیخ احمد شاکر۔ (التعلیق علی المحلی: ۲/۷۵، مقدمة مفتاح کنوز السنة ص:غ)

(۳) شیخ ابو عبیدہ مشہور بن حسن آل سلمان۔ (کتب حذر منھا العلماء:۲/۲۷۲-۲۷۴)

کیا موصوف العلل الکبیر کا انکار کرنے والے بھی دکھا سکتے ہیں؟ اس لیے العلل الکبیر کو مسندِ زید پر قیاس کرتے ہوئے غلط منسوب قرار دینا درست نہیں۔

## مسند الربیع کی کہانی شیخ زبیر کی زبانی:

مولانا ندیم لکھتے ہیں:

''مسند الربیع بن حبیب بہ سند صحیح ثابت نہ ہونے کی بنا پر متروک قرار پائی ہے۔'' (ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص:۱۳۳۔ مئی تا اگست ۲۰۱۵ء)

اس مسند میں اور کیا کیا قباحتیں ہیں، مولانا زبیر مرحوم کے رشحاتِ قلم ملاحظہ فرمائیں اور فیصلہ کریں کہ العلل الکبیر میں اور اس مسند میں کتنا فرق ہے، چنانچہ موصوف رقم طراز ہیں:

''مسند الربیع بن حبیب نامی کتاب ہرگز ثابت نہیں:

الجامع الصحیح مسند الإمام الربیع بن حبیب کے نام سے خارجیوں (اباضیوں) کی کتاب ہرگز ثابت نہیں، لہٰذا اس کی کسی ایک روایت سے بھی استدلال مردود ہے۔

(۱) اس کا بنیادی راوی ربیع بن حبیب بن عمر الأزدي البصري مجہول ہے۔ (دیکھیے: کتب حذر منھا العلماء لأبي عبیدة مشہور بن حسن:۲/۲۹۵)

(۲) ربیع بن حبیب سے نیچے والی سند کا راوی ابو یعقوب یوسف بن ابراہیم بن صیاد الاباضی، یعنی خارجی (گمراہ؛ ضال مضل) اور مجہول العدالت ہے۔

(۳) یوسف بن ابراہیم سے ربیع بن حبیب تک سند نامعلوم ہے۔

(۴) یوسف بن ابراہیم تک سند بھی نامعلوم ہے۔

(۵) ربیع بن حبیب کا مذکور استاد ابو عبیدہ مسلم بن ابی کریمہ التمیمي بھی مجہول ہے۔

(۶) خیر القرون اور زمانۂ تدوینِ حدیث کے ثقہ محدثین میں سے کسی نے بھی اس کتاب، یعنی مسند الربیع بن حبیب کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

(۷) اس کتاب میں بشر بن غیاث المریسی وغیرہ کذاب اور دجال راویوں سے بھی روایات موجود ہیں، لہٰذا اِس مجہول کتاب کو "الجامع الصحیح" قرار دینا بہت بڑا جھوٹ ہے۔

(۸) اس جعلی مسند میں موزوں پر مسح کرنے کے خلاف اور اسی طرح کی دوسری جھوٹی روایات بھی موجود ہیں۔

(۹) اس جعلی مسند میں فاتحہ خلف الامام کی وہ روایت بھی موجود ہے جس میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے مقتدیوں سے فرمایا: سورۂ فاتحہ کے سوا کچھ نہ پڑھو کیوں کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ جو لوگ اس کتاب کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اسے بھی تسلیم کریں!

(۱۰) اس مسند کی کئی روایات صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہما کی صحیح احادیث کے خلاف ہیں۔'' (ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ:۱۰۶، آخری اندرونی صفحہ:۴۹۔ جون ۲۰۱۳ء)

مزید لکھتے ہیں:

''بعض لوگ شیعوں کی کتاب ''مسندِ زید'' اور خارجیوں کی کتاب ''مسند الربیع بن حبیب'' کے حوالے پیش کرتے ہیں حالانکہ یہ دونوں غیر ثابت اور باطل کتابیں ہیں۔''

(نور العینین، ص:۴۰۹)

## مسند الربیع پر شیخ البانی کا نقد:

محدث البانی نے بھی مسند الربیع بن حبیب کی خوب خبر لی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

① ......''اسے ربیع بن حبیب ازدی بصری نامی شخص نے اپنی طرف منسوب کتاب، جو "الجامع الصحیح" کے نام کے تحت اباضیہ کی کتب میں موجود ہے، میں ذکر کیا ہے......موصوف ربیع اجنبی شخص تھا۔ سیرت نگاری پر مشتمل ہمارے علماء کی کتب میں اس راوی کا کوئی اتا پتا موجود نہیں، چنانچہ حتی کہ اباضیہ بھی اس کے معمولی حالات ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکے، سوائے اس کے کہ اُنھوں نے خاصے تکلف سے اس کے اساتذہ اور تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ جس کی بنیاد ان کے اپنے مخصوص اور ربیع موصوف کے زمانے سے نہایت متاخر مصادر پر ہے۔ اُنھوں نے اس کے حالاتِ زندگی کے لیے معروف کتبِ تراجم اور مشہور کتبِ تاریخ میں سے کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا۔''

(الضعیفۃ:۱۲/۲/۹۲۱ اور دیکھیے:۱۳/۲/ ۷۲۸، ۷۲۹)

② ......''اس کا نام المسند تھا۔ اُنھوں نے اپنی طرف سے الصحیح کا اضافہ کر دیا تا کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں اور تا کہ وہ اباضیوں کو اہل سنت کی کتاب المسند الصحیح للبخاري (صحیح بخاری) کی طرح کتاب دے سکیں۔ ان دونوں (مسند الربیع اور صحیح بخاری کے مقام) میں بہت زیادہ بُعد ہے......الخ۔'' (الضعیفۃ:۱۲/۲/۹۲۶)

③ ......ازاں بعد ابوبکر ہذلی، بشر المریسی، حسن بن دینار عن خصیب بن جحدر اور کلبی جیسے معروف ترین جھوٹوں کی روایات کی نشان دہی کی۔ ضعفاء اور مجاہیل کی روایات اس پر مستزاد ہیں۔ (ملاحظہ ہو الضعیفۃ:۱۲/۲/۹۲۶، ۹۲۷)

④ ......''اُنھوں (اباضیوں) نے اسے مسند الربیع بن حبیب میں ذکر کیا ہے جس کا نام اُنھوں نے المسند الصحیح رکھا ہے۔ اس کا صحیح حدیث سے کوئی تعلق نہیں، سوائے اس کے جو اہلِ سنت کی کتاوں سے چرایا گیا ہے۔''

(الضعیفۃ:۱۲/۲/۹۳۱)

⑤ ......''مسند الربیع بن حبیب، جسے اباضیہ الجامع الصحیح سے موسوم کرتے ہیں، وہ منکر اور باطل احادیث سے بھری پڑی ہے جنھیں بیان کرنے میں یہ مسند تنہا ہے۔ دسیوں، سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں (احادیث پر مشتمل) کتبِ حدیثیہ جو مطبوع اور مخطوط ہیں، میں بھی اس کی متابعت موجود نہیں۔ جن کے مولفین عدالت، ثقاہت اور حافظے میں مشہور ہیں۔ برعکس اس ربیع کے۔ اباضیہ کی چند کتب، جو اس کی وفات کے مدتوں بعد لکھی گئیں، میں اس کا کچھ تذکرہ موجود ہے۔ اس کے باوجود ان کتب میں موجود اس کے ترجمے میں مشہور محدثین، جو اس کے ہم عصر ہوں یا قریب زمانہ سے تعلق رکھنے والے ہوں، سے اس کے بارے میں کچھ منقول نہیں۔'' (الضعیفۃ:۱۳/۱/۱۰۵، ۱۰۶)

⑥ ......''اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس نے اسے مسند الربیع میں داخل کیا ہے، اس نے بعض سندوں سے اس حدیث کے متن کو چرایا ہے، پھر اسے جابر بن زید (تابعی) کی طرف منسوب کیا ہے اور وہ اس سے اسی طرح بری الذمہ ہیں جس طرح بھیڑیا ابن یعقوب (حضرت یوسف علیہ السلام) کے خون سے بری ہے۔'' (الضعیفۃ:۱۳/۱/۲۵۹)

⑦...... ”جعلی حدیث ہے۔ اس پر بناوٹی، پھسپھسے پن اور علمِ کلام کے آثار بالکل واضح ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اسے کسی بھی اہلِ سنت محدث نے روایت نہیں کیا۔ اسے بیان کرنے میں مسند الربیع بن حبیب منفرد ہے۔ جس کا مولف ثقاہت اور ضبط کے اعتبار سے معروف نہیں، حتی کہ اس کے متعبین اباضیہ کے ہاں بھی وہ معروف نہیں۔“ (الضعیفة: ۱۳/۲/ ۲۸، ۲۷، ۲۹)

علامہ البانی نے اس کی متعدد روایات کو موضوع اور باطل قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو الضعیفة، احادیث: ۵۹۶۲، ۵۹۶۳، ۵۹۶۴)

ملحوظ رہے کہ علامہ البانی العلل الکبیر کو امام ترمذی کی کتاب سمجھتے تھے۔ جس کے متعدد حوالے ہم گزشتہ مضمون (مطبوعہ ہفت روزہ الاعتصام، لاہور: جلد: ۶۷، شمارہ: ۲۵۔ ۲۰۱۵ء) میں ذکر کر چکے ہیں۔

شیخ ابوعبیدہ مشہور بن حسن آل سلمان لکھتے ہیں:

”اس کا مولف اجنبی، مجہول اور غیر مشہور ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسند غلط منسوب ہوئی ہے۔ اس کا مولف مجہول ہے۔“

(کتب حذر منها العلماء: ۲/ ۲۹۵، ۲۹۷)

اس لیے اس مسند کا تقابل العلل الکبیر سے کرنا غلط ہے۔

(باقی آئندہ)

❀❀❀



## بقیہ : چیونٹی کا دم!

اس سے مراد وہی دم ہے جو قبل ازیں مذکور ہوا۔ آپ ﷺ کا مقصود مذکورہ دم سکھانا نہیں تھا۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اس قسم کے لایعنی اور بے مقصد کلام کو سیکھنے سکھانے کا حکم نہیں دے سکتے، نیز اِس قسم کے الفاظ بیماری میں نہ تو کچھ فائدہ دے سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ بلکہ آپ ﷺ کا مقصود راز کو اِفشا کر دینے پر حضرت حفصہ کو لطیف اور مشفقانہ انداز میں تنبیہ کرنا تھا کہ اس میں ایک دلہن کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ خوش خوش رہنے اور اہلِ خانہ کو خوش رکھنے کے لیے جو کام چاہے کرلے مگر کسی بھی صورت میں شوہر کی حکم عدولی نہ کرے۔

مگر پسِ منظر کا علم نہ ہونے اور ”نملة“ کے معنی پر غور نہ کرنے کی وجہ سے یہ فروگزاشت اور مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوئی۔

یاد رہے کہ پختہ کار اہلِ علم نے اپنے تراجم اور کتابوں میں پیشِ نظر حدیث کا صحیح ترجمہ کیا ہے، مثلاً:

۱: سنن ابي داود، ترجمہ: مولانا ابوعمار عمر فاروق السعیدی (مطبوعہ دار السلام، لاہور)۔

۲: سنن ابن ماجہ، ترجمہ: مولانا عطاء اللہ ساجد (حدیث: ۳۵۱۶۔ مطبوعہ دار السلام، لاہور)۔

۳: سنن ابن ماجہ (مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ)۔

۴: الفتح الرباني لترتيب مسند الإمام أحمد الشيباني (۷/ ۳۰۰۔ اردو)۔

۵: مشکاة المصابيح (۲/ ۱۱۷، حدیث: ۴۵۶۱۔ ترجمہ: ابو انس محمد سرور گوہر۔ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ)۔

۶: مشکاة المصابيح (۳/ ۵۴۲۔ ترجمہ: مولانا محمد صادق خلیل)۔

۷: تعلیمِ محمدی از مولانا محمد جوناگڑھی (ص: ۵)۔

۸: طبِ نبوی از امام ابن القیم (ص: ۲۳۳، اردو۔ مطبوعہ شمع بک ایجنسی)۔

۹: صحابیات طیبات (ص: ۲۰۵۔ ترجمہ: مولانا محمود احمد غضنفر۔ (مطبوعہ نعمانی کتب خانہ)۔

❀❀❀

# سندِ کتاب میں منہجی غلطی کا جائزہ

محمد خبیب احمد (ادارہ علوم اثریہ، فیصل آباد)

## کتاب الجهاد لعبد الله بن المبارك:

مولانا ندیم صاحب رقم طراز ہیں:

''کتاب الجہاد لابن المبارک بہ سند صحیح ثابت نہ ہونے کی بنا پر متروک قرار پائی ہے۔ (دیکھیے تحریر علوم الحدیث: ۲/۸۷۹)۔''

(ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۳)

امام بن المبارک سے کتاب الجہاد کو روایت کرنے والا راوی سعید بن رحمہ بن نعیم المصصي ابوعثمان ہے۔ (کتاب الجہاد، ص: ۲۷) جو بلاشبہ ضعیف راوی ہے۔ حافظ ابن حبان فرماتے ہیں:

''وہ محمد بن حمیر سے ایسی چیزیں روایت کرتا ہے جس میں اس کی متابعت نہیں۔ اس سے شام کے باشندگان روایت کرتے ہیں۔ اس سے استدلال کرنا درست نہیں کیوں کہ وہ احادیث بیان کرنے میں اثبات راویوں کی مخالفت کرتا ہے۔'' (المجروحین، ص: ۱/ ۳۲۸)

اسی راوی کی بنا پر شیخ جُدیع نے اس کتاب کا انکار کیا ہے۔ مگر آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ شیخ جُدیع ''العلل الکبیر'' کو امام ترمذی کی تصنیف سمجھتے ہیں اور بالجزم اس سے حوالے بھی نقل کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تحریر علوم الحدیث: ۱/ ۱۴۱، ۱۷۳، ۳۶۹، ۴۳۸، ۵۷۸، ۶۰۵۔ ۲/ ۶۶۰، ۶۷۴، ۷۷۱، ۷۸۳، ۸۲۰، ۹۶۹، ۹۷۵، ۱۰۲۵)

علامہ البانی، سعید بن رحمہ پر امام ابن حبان کی جرح نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''حافظ ذہبی نے یہ جرح حافظ ابن حبان سے میزان میں اور (حافظ ابن حجر) عسقلانی نے لسان میں نقل کی ہے۔ ان دونوں نے اسے کتاب الجهاد لابن المبارك کا راوی ہونا بھی ذکر کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ جرح حافظ (ابن حجر) پر کیسے مخفی رہ گئی اور گزشتہ مقام پر مذکور کتاب الإصابة میں اس پر کیسے اعتماد کرلیا!''

(الصحيحة: ۷/ ۲/ ۱۰۳٤)

یعنی سعید بن رحمہ کی وجہ سے شیخ البانی بھی اس کتاب پر اعتماد نہیں کرتے۔ اس کتاب کے بارے میں یہ پہلی رائے ہے۔ اب دوسری رائے بھی ملاحظہ فرمایئے:

### روایت حدیث وکتاب کے بارے میں علامہ الحوینی کی رائے:

الشیخ ابو اسحاق الحوینی عالمِ اسلام کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی تالیفات وتحقیقات ایک صد چوالیس (۱۴۴) نا بہ نام مذکور ہیں۔ (مقدمہ نثل النبال: ۱/ ۵۵-۷۳ـ طبع اول) جو اُن کے اس فن میں تبحر پر بہ خوبی دلالت کرتی ہیں (بلکہ نثل النبال کے دوسرے ایڈیشن میں ان کتب کی تعداد (۱۵۴) تک جا پہنچی ہے)۔ وہ روایتِ حدیث اور روایتِ کتاب کے مابین فرق کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''حدیث بیان کرنے اور کتاب روایت کرنے کے درمیان علماء فرق کرتے ہیں۔ وہ ایسے لین الحفظ (کمزور یادداشت والے) راوی سے چشم پوشی کرتے ہیں جو ایسی کتاب روایت کرتا ہے جس کی وہ دیکھ بھال کرتا ہے اور اس کے لیے مشقت جھیلتا ہے۔ وہ اسے محض حدیث میں مسترد کرتے ہیں یا تردد کا اظہار کرتے ہیں۔ کیا آپ نے کتاب الجهاد لابن المبارك نہیں دیکھی جسے ان سے سعید

بن رحمہ بن نعیم المصیصي روایت کرتا ہے۔ وہ اسے ابن المبارک سے بیان کرنے میں منفرد ہے۔ ابن حبان نے المجروحین (۱/ ۳۲۸) میں اس کے بارے میں کہا ہے:

''اس سے استدلال جائز نہیں کیوں کہ وہ روایات میں اثبات (ثقہ راویان) کی مخالفت کرتا ہے۔''

اس کے باوجود میری معلومات کے مطابق کسی عالم نے کتاب الجہاد کی نسبت ابن المبارک کی طرف کرنے میں تردد کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس کی احادیث کو ضعیف کہا ہے بلکہ وہ یوں کہتے ہیں کہ اسے ابن المبارک کتاب الجہاد میں سندِ صحیح یا سندِ حسن سے بیان کرتے ہیں۔ وہ سعید بن رحمہ کی وجہ سے کتاب (کی صحت) کو عیب دار نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ابن محرز کا معاملہ ہے، جو ابوعباس احمد بن محمد بن قاسم بن محرز کتاب معرفة الرجال کا راوی ہے جس میں اُنھوں نے ابن معین سے جرح و تعدیل کی بابت (اقوال) کیے ہیں۔ مجھے اس کے بارے میں جرح یا تعدیل کا کوئی علم نہیں۔ میری دسترس میں موجود مراجع میں اس کا ترجمہ موجود نہیں۔ اس کے باوجود علماء اس کی وساطت سے ابن معین کی طرف قول کو منسوب کرتے ہیں۔ میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اسے قبول کرنے میں توقف کیا ہو۔ اس بارے میں مثالوں کا ذکر ہی تطویل کا باعث ہے۔

اسی طرح اسباط بن نصر نے سُدّي (إسماعیل بن عبدالرحمان بن أبي کریمه؛ السدّي الکبیر) سے تفسیر حاصل کی ہے اور اس پر توجہ دی ہے۔

معلوم ہی ہے کہ کتاب کی شکل میں کسی چیز کو محفوظ کرنا ضبطِ صدر سے زیادہ مضبوط ہے، اگرچہ ضبطِ صدر ضبطِ کتاب سے اعلیٰ ہے۔'' (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۸۸، ۴۸۹ بہ حوالہ نثل النبال: ۱/ ۱۵۵، ۱۵۶)

شیخ ابو اسحاق الحوینی حافظ ابن حبان کی جرح کی یوں تفسیر بیان کرتے ہیں:

''سعید بن رحمہ پر صرف اسی صورت میں گرفت کی جائے گی جب وہ محمد بن حمیر سے بہ طورِ خاص روایت کرے گا۔ اس کے بارے میں ابن حبان کی جرح عام نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابن حبان نے اپنے نقد ''اس سے استدلال درست نہیں کیوں کہ وہ احادیث بیان کرنے میں اثبات (ثقہ راویان) کی مخالفت کرتا ہے'' یعنی محمد بن حمیر سے۔ اُنھوں نے اس کی ایسی منکر حدیث بیان نہیں کی جو محمد بن حمیر کے علاوہ ہو۔ اگر انھیں مل جاتی تو وہ اسے فوراً درج کرتے، جیسا کہ (ان کی) اس (عادت) کو ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے المجروحین لابن حبان کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہو۔'' (غوث المکدود بتخریج منتقی ابن الجارود: ۲/ ۲۲۰، ۲۲۱)

نیز لکھتے ہیں:

''اگر ہمیں کسی حدیث کی سند میں سعید بن رحمہ مل جائے تو ہم اس کی وجہ سے اس روایت کو ضعیف قرار دیں گے۔ روایتِ کتاب اور احادیث مسلسل روایت کرنے میں فرق واضح ہے۔'' (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۸۸ بہ حوالہ نثل النبال: ۱/ ۵۰۸)

**الشیخ ابوعبیدہ کی رائے:**

الشیخ ابوعبیدہ مشہور بن حسن آل سلمان کی کتاب ''کتب حذر منها العلماء'' اپنے موضوع پر ایک معرکہ آراء کتاب ہے جس میں اُنھوں نے ملحدین، مبتدعین اور زنادقہ وغیرہ کی کتب ذکر کرنے کے بعد جھوٹی، غلط منسوب، مسروقہ، موضوع اور ضعیف احادیث پر مشتمل، علمِ نجوم، شعبدہ بازی، جادوگری پر مبنی، منہجِ سلف اور سلف صالحین کے مخالف وغیرہ کتب ذکر کی ہیں۔

آپ پہلے پڑھ آئے ہیں کہ الشیخ ابو عبیدہ نے مسند الربیع بن حبیب اور مسند زید کو نا قابلِ اعتبار قرار دیا ہے مگر وہ اپنی اسی کتاب میں کتاب الجهاد کے بارے میں فرماتے ہیں:

"الجهاد لابن المبارك: اس مقام پر یہ تنبیہ نہایت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بعض محققین عبداللہ بن مبارک کی طرف کتاب الجہاد کی نسبت میں کمزوری ثابت کرتے ہیں کیوں کہ ان سے سعید بن رحمہ بیان کرتا ہے۔ ابن حبان نے الثقات (۱/ ۳۲۸) [صوابه: المجروحين] میں اس کے بارے میں جو لکھا ان کے الفاظ یہ ہیں:

''وہ محمد بن حمیر سے ایسی چیزیں بیان کرتا ہے جس میں اس کی متابعت نہیں۔ اس سے اہلِ شام روایت کرتے ہیں۔ اس سے احتجاج جائز نہیں کیوں کہ وہ روایات میں اثبات (ثقہ راویوں) کی مخالفت کرتا ہے۔''

اس جرح سے یہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ سعید پر جرح محمد بن حمیر کی روایت کے ساتھ خاص ہے۔ جس کی تاکید حافظ ابن حبان کا قول ''اس سے احتجاج جائز نہیں کیوں کہ وہ روایات میں اثبات (ثقہ راویان) کی مخالفت کرتا ہے۔'' کرتا ہے۔ اُنھوں نے اس کی منکر روایت جو بیان کی ہے وہ صرف اس (محمد بن حمیر) کے واسطے سے ہے۔

بنا بریں عبداللہ بن مبارک کی طرف کتاب الجہاد کی نسبت صحیح ہے۔ تخریج کرنے والے بھی ہمیشہ سے یہ کہتے آئے ہیں کہ ''اسے ابن المبارک نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔'' اس پر متنبہ ہو جائیں اور بے خبروں میں سے نہ ہوں۔''

(كتب حذر منها العلماء: ۲/ ۳٦٥)

راقم الحروف کی تحقیق میں سعید بن رحمہ کے بارے میں محدثین کے اقوال اور تعامل کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

۱: اس کی عدمِ توثیق کی بنا پر اس کی حدیث ضعیف ہوگی۔

۲: محمد بن حمیر سے اس کی روایت منکر ہوگی۔ حافظ ابن حبان کی جرح اسی پر محمول کی جائے گی۔

پہلی اور اس صورت میں فرق یہ ہے کہ صورتِ اول میں اس کی متابعت اس کے ضعف کو کم کر دے گی، جب کہ صورتِ دوم میں اس کی متابعت اگر موجود بھی ہو تو اُسے کوئی فائدہ نہیں دے گی اور روایت منکر ہی رہے گی۔

۳: اگر وہ سندِ کتاب میں ہو تو اس کی کتاب مقبول ہوگی۔

یہاں یہ تنبیہ بھی ضروری ہے کہ علامہ البانی نے سعيد بن رحمة عن ابن المبارك کی ایک روایت کو منکر قرار دیا ہے اور اس میں دو علتیں ذکر کی ہیں: ارسال اور سعید بن رحمہ کا ضعف۔

وہ دوسری علت کے بارے میں حافظ ابن حبان کی جرح نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اس (سعید بن رحمہ) کا اس حدیث کا دوسرا جملہ ((عين سهرت بكتاب الله)) روایت کرنا اس کے ضعف پر دلالت کرتا ہے اور بدونِ متابعت والی حدیث کی نشان دہی کرتا ہے۔

یہ حدیث صحابہ کرام کی ایک جماعت سے مروی ہے جن میں سے پانچ صحابہ کی احادیث کی تخریج میں نے کی ہے۔ ان میں مذکورہ بالا جملہ موجود نہیں۔''

(السلسلة الضعيفة: ١٤/ ١/ ١٢٧، حديث: ٦٥٥٣)

الشیخ نبیل بن منصور نے نو صحابہ سے اس روایت کی تخریج کی ہے۔ (أنيس الساري: ۴/ ۲۸۸۰)

علامہ البانی کی ذکر کردہ روایت کتاب الجهاد لا بن المبارك (ص: ۱۴۹، حدیث: ۱۸۸) اور الترغيب للأصبهاني: ۱/ ۳۰۷، ۳۰۸، حدیث: ۵۰۸) میں ہے۔ لہٰذا اِس میں وجہِ ضعف سعید بن رحمہ کو قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اس کا اصل سببِ ضعف مرسل ہونا ہے، لہٰذا یہ روایت منکر نہیں ہوگی (جیسا کہ

علامہ البانی نے لکھا ہے) بلکہ ضعیف ہوگی۔ اگر سعید بن رحمہ محض حدیث کا راوی ہوتا، یعنی کتاب الجہاد میں یہ روایت نہ ہوتی تو ثقات کی مخالفت کی وجہ سے اس کی روایت منکر ہوتی تھی، بالخصوص محمد بن حمیر سے۔

اس طالب علم کے استقرا کے مطابق متقدمین میں سے کسی نے سعيد بن رحمه عن ابن المبارك کی روایت کو منکر نہیں کہا۔ اور سعيد عن محمد بن حمير کی سند کو منکر کہنے والے غالباً سب سے پہلے حافظ ابن حبان ہیں۔

حافظ ذہبی نے سعید بن رحمہ کو میزان الاعتدال وغیرہ میں درج کر کے لکھا ہے:

''وہ ابن المبارک سے کتاب الجہاد کا راوی ہے۔'' (میزان الاعتدال: ۲/ ۱۳۵، ترجمہ: ۳۱۷۲، تاريخ الإسلام ص: ۱۵۳۔ حوادث: ۲۵۱ھ-۲۶۰ھ)

اس کے باوجود انھوں نے اس کتاب کا انکار نہیں کیا بلکہ لکھا ہے:

"وقال ابن المبارك في "الجهاد" له."

''ابن المبارک نے اپنی کتاب الجہاد میں کہا ہے۔''

(سير أعلام النبلاء: ۱/ ۱۵)

حافظ ابن حجر نے بھی لسان المیزان میں میزان الاعتدال والی ساری عبارت بدون نقد نقل کی ہے۔ (ملاحظہ ہو لسان المیزان: ۴/ ۵۰، ترجمہ: ۳۴۱۸)

چونکہ ندیم صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ''كتاب الجهاد لابن المبارك کے حوالے حافظ ابن حجر (فتح الباري: ۷/ ۸۳) سمیت کئی علماء نے دیے ہیں۔'' (ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۳) اس لیے ہم حافظ ابن حجر کے حوالوں کی طرف نہیں جانا چاہتے، البتہ یہ ضرور ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کتاب حافظ ابن حجر کے مسموعات میں سے ہے۔ (دیکھیے المعجم المفهرس ص: ۸۹، کتاب: ۱۸۶، تغليق التعليق: ۵/ ۴۷۰)

مزید عرض ہے کہ حافظ ابن حجر نے امام ابن المبارک کی کتاب الجہاد کی سند کو صحیح کہا ہے۔ وہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''جنگِ احد کے روز وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم بردار تھے۔ یہ ابن المبارک کی کتاب الجہاد میں سندِ صحیح کے ساتھ عبید بن عمیر کی مرسل روایت میں ثابت ہے۔''

(فتح الباري: ۱۱/ ۲۷۹، تحت حديث: ۶۴۴۸)

اس لیے اس بارے میں علامہ البانی اور علامہ جُدیع کا موقف مرجوح ہے۔ متذکرہ محدثین اور علماء کا موقف ہی درست ہے۔ اور یہی منہج محدثین ہے جس پر مولانا زبیر مرحوم بھی گامزن رہے، جیسا کہ آئندہ آرہا ہے۔

**تنبیہ:** حافظ ابوبکر محمد بن خير إشبيلي (وفات: ۵۷۵ھ) نے اپنی سند سے كتاب فضل الجهاد (تالیف: عبداللہ بن المبارک) روایت کی ہے۔ (فهرسة ابن خير الإشبيلي ص: ۲۰۵، کتاب: ۴۳۴)

اگر اس کتاب سے مراد مطبوع كتاب الجهاد ہے تو اس کی یہ دوسری سند جو أبو مروان عبدالملك بن حبيب البزاز المصيصي عن ابن المبارك ہے۔

ملحوظ رہے کہ مطبوع کتاب کا نام "كتاب الجهاد" ہے اور حافظ إشبيلي کی ذکر کردہ کتاب کا نام "كتاب فضل الجهاد" ہے۔

کیا مولانا ندیم اپنے استاد محترم مولانا زبیر علی زئی مرحوم کی درج ذیل عبارت کا مطلب قارئین کو سمجھا سکتے ہیں:

''مزید تفصیل کے لیے شیخ الاسلام المجاہد عبداللہ بن المبارک المروزی کی ''کتاب الجہاد'' وغیرہ کا مطالعہ فرمائیں۔''

(تحقیقی مقالات: ۱/ ۶۰)

## مولانا زبیر کی ''بے اُصولی'':

مولانا ندیم لکھتے ہیں:

''محض استدلال کو اصول شمار کرنا خود بے اُصولی ہے۔جس طرح کسی محدث کا ضعیف روایت سے استدلال اس کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں۔اسی طرح کسی غیر ثابت کتاب سے استدلال یا حوالہ نقل کرنا اس کے ثابت ہونے کی دلیل نہیں ہے۔''(ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ:۱۲۹-۱۳۲،ص:۱۳۲)

اگر استدلال کو اُصول شمار کرنا بجائے خود بے اُصولی ہے تو اس میں یہ ہیچ مداں تنہا نہیں بلکہ مولانا زبیر مرحوم بھی اس ''بے اُصولی'' کا ''ارتکاب'' کر چکے ہیں۔ہم نے انھی کے حوالے سے لکھا تھا:

''شیخ زبیر علی زئی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: امام بیہقی وغیرہ اکابر علماء نے امام بخاری کی کتاب القراءۃ سے استدلال کیا ہے جو اس کی دلیل ہے کہ وہ اسے امام بخاری کی تصنیف کردہ کتاب ہی سمجھتے ہیں۔(مقدمہ نصر الباری،ص:۱۹)۔''

(ہفت روزہ الاعتصام، لاہور، جلد:۶۷،شمارہ:۲۴،ص:۲۳)

ندیم صاحب نے اس کا جواب دینے کے بجائے اس سے آنکھیں چرالیں۔اور فقیر پر چڑھ دوڑے اور یہ بھول گئے کہ ان کے الفاظ کی زد ان کے اپنے استاد پر بھی پڑ رہی ہے!

مولانا زبیر کی مزید ''بے اُصولی'' ملاحظہ فرمائیں:

٭ موصوف لکھتے ہیں:

''علامہ نووی نے جزء رفع الیدین سے ایک روایت بہ طورِ جزم نقل کی اور فرمایا: "بإسناده الصحيح عن نافع." معلوم ہوا کہ نووی جزء رفع الیدین کو امام بخاری کی صحیح و ثابت کتاب سمجھتے تھے۔''

لیجیے! امام نووی کا جزء رفع اليدين للبخاري سے بہ طورِ جزم روایت نقل کرنا اور اس کی سند کو صحیح کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسے امام بخاری کی کتاب سمجھتے تھے۔کیا امام نووی کے استدلال سے اُنھوں نے یہ اُصول مستنبط نہیں کیا کہ وہ امام بخاری کی کتاب ہے!

مولانا مرحوم نے امام نووی کے بعد اسی بابت امام ابن ملقن، حافظ زیلعی، امام بیہقی، علامہ عینی، علامہ زرکشی، علامہ زرقانی، حافظ سیوطی، امام ذہبی اور حافظ مغلطائی کے حوالے ذکر کیے اور لکھا:

''ان سب نے جزء القراءۃ یا جزء رفع الیدین کے حوالے بہ طورِ جزم و بہ طورِ حجت نقل کیے ہیں اور بعض نے تو رفع الیدین سے مذکور ایک روایت کو صحیح سند قرار دیا ہے! ہمارے علم کے مطابق محمود بن اسحاق پر کسی محدث یا مستند عالم نے کوئی جرح نہیں کی اور ان کی بیان کردہ کتابوں اور روایتوں کو صحیح قرار دینا (ان پر جرح نہ ہونے کی حالت میں) اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مذکورہ تمام علماء وغیرہ کے نزدیک ثقہ وصدوق تھے، لہٰذا جزء القراءۃ اور جزء رفع الیدین دونوں کتابیں امام بخاری سے ثابت ہیں۔''

(نور العینین،ص:۳۲۸، تحقیقی مقالات:۵/۲۲۲)

٭ ''حافظ ابن حجر کا محمود مذکور کی حدیث کو حسن کہنا اور مذکورہ وغیر مذکورہ علماء کا جزء رفع الیدین و کتاب القراءۃ کو بہ طورِ جزم ذکر کرنا تلقي بالقبول ہے۔''

(تحقیقی مقالات:۴/۴۵۳)

٭ ''ہمارے علم کے مطابق کسی امام نے جزء رفع الیدین کے امام بخاری کی کتاب ہونے کا انکار نہیں کیا۔''

(تحقیقی مقالات:۶/۹۴)

سوال یہ ہے کہ محدثین کے استدلال سے یہ دونوں کتابیں اگر امام بخاری کی ہوسکتی ہیں تو العلل الکبیر امام ترمذی کی کیوں نہیں ہوسکتی؟

مولانا مرحوم حافظ ابن حبان کی ایک مفقود کتاب کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوم: حافظ ابن حبان سے کتاب الصلاۃ منقول نہیں

ہے۔عرض ہے کہ حافظ ابن حبان کی کتاب الصلاۃ (صفة الصلاة، وصف الصلاة بالسنة) کا ذکر درج ذیل کتابوں میں موجود ہے:
البدر المنیر لابن الملقن:۱/۲۸۳،۲/۴۷۲، ۳/۴۹۴وغیرہ۔طرح التثریب في شرح التقریب لأبي زرعة ابن العراقي:۱/۱۰۲۔ تہذیب السنن لابن القیم:۱/ ۳۶۸،ح:۱۹:۷۔اتحاف المھرة لابن حجر العسقلاني:۱/۲۳۵،ح:۸۳ وغیرہ۔التلخیص الحبیر:۱/۲۱۶،۲۱۷،ح:۳۲۳، ۳۲۴۔معجم البلدان لیاقوت الحموي:۱/۴۱۸۔مغني المحتاج إلی معرفة معاني ألفاظ المنھاج للخطیب الشربیني:۱/۲۶۱ بحوالہ المکتبة الشاملة وغیرہ۔
بلکہ حافظ ابن حبان نے اپنی صحیح ابن حبان میں اپنی کتاب صفة الصلاة کا علیحدہ ذکر کیا ہے۔(دیکھیے الإحسان: ۶/۱۸۴، ح:۱۸۶۷۔دوسرا نسخہ:۱۸۶۴)ان حوالوں کے باوجود کسی لاعلم شخص کا یہ قول ''میری تحقیق میں حافظ ابن حبان سے کتاب صلاۃ منقول نہیں ہے'' کیا حیثیت رکھتا ہے؟'' (نور العینین،ص:۴۱۶)
قارئین کرام!ذرا غور کیجیے کہ مولانا مرحوم نے کتاب الصلاۃ کے ثبوت کے لیے دو دلائل دیے ہیں اور مضبوط دلیل کو مقدم کیا ہے:
(۱)محدثین کا اس کتاب سے استدلال کرنا یا اس کتاب کا ذکر کرنا۔
(۲)مصنف کا اس کا ذکر اپنی کسی دوسری کتاب میں کرنا۔
اگر نقلِ محدثین کا کوئی اعتبار نہیں تو اسے مضبوط دلیل کے طور پر پہلے کیوں ذکر کیا؟ علماء و محدثین کا استدلال اُصول نہیں تو ان کے استدلال سے اُصول کا قاعدہ کیوں وضع کیا؟

اگر کوئی کہے کہ کتاب الصلاۃ کا ذکر خود مصنف نے بھی کیا ہے جب کہ العلل الکبیر کا ذکر امام ترمذی نے نہیں کیا!!!
عرض ہے کہ اس ناحیے سے کتاب الصلاۃ کی العلل الکبیر پر برتری ثابت ہوتی ہے۔ہم سابقہ مضمون میں عرض کر چکے ہیں کہ صحتِ کتاب کی سات شرائط ہیں جتنی وہ کم ہوتی جائیں گی کتاب کی ثقاہت اسی قدر متاثر ہوتی جائے گی، لیکن رہے گی وہ قبول کے دائرے میں!
اگر محدثین کے نقل سے مفقود کتاب کی صحت تسلیم کی جاسکتی ہے تو موجودہ کتاب کی صحت کیوں نہیں مانی جاسکتی؟
مولانا مرحوم ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:
''المنتخب والی کتاب بالاتفاق علماء کے درمیان مشہور رہی ہے، مثلاً دیکھیے:التقیید لابن نقطة،ص:۳۶،ت: ۱۱،سیر أعلام النبلاء:۱۲/ ۲۳۵،۲۳۶،تاریخ الإسلام: ۱۸/ ۳۴۱اور المعجم المفھرس لابن حجر،ص:۱۳۴،رقم:۴۸۲وغیرہ)اس کی سند بھی موجود ہے جس کا کوئی راوی ضعیف نہیں۔پتا نہیں حافظ صاحب (ثناء اللہ ضیاء صاحب)اس عظیم الشان کتاب کا کیوں انکار کر رہے ہیں؟!''(تحقیقی مقالات:۲/ ۴۱۷)
مولانا نے امام عبد بن حمید کی اصل کتاب نہیں بلکہ "المنتخب" کے اثبات کے لیے دو دلائل ذکر کیے ہیں:
(۱)محدثین کے ہاں اس کی شہرت۔
(۲)صحیح سند کی موجودگی۔
عرض ہے کہ ان دونوں دلیلوں میں سے پہلی دلیل العلل الکبیر میں موجود ہے۔اگر منتخب عبد بن حمید محدثین کے ہاں شہرت کی وجہ سے معتبر ہوسکتی ہے تو العلل الکبیر کیوں نہیں؟
ندیم صاحب سے گزارش ہے کہ ''بے اُصولی'' کا تازیانہ اس طالبِ علم پر نہ برسائیں کہ اس کی زد میں آپ کے شیخ بھی آتے ہیں!

ندیم صاحب کی ضیافتِ طبع کے لیے انھی کے استادِ محترم کا کلام پیش ہے:

''بہ طورِ لطیفہ عرض ہے کہ ہمارے علاقے میں ایک مشہور قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھا ہوا آری کے ساتھ اسے کاٹ رہا تھا۔ جس حصے کو وہ کاٹ رہا تھا وہ درخت کی طرف تھا اور یہ خود دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا، پھر نتیجہ کیا ہوا؟ دھڑام سے نیچے آ رہا اور ایسی ''پھکی'' ملی کہ دن میں بھی تارے نظر آ گئے۔''

(نور العینین، ص: ۵۰۳، ۵۰۴)

اس سے قطع نظر کہ یہ واقعہ کس شخص سے پیش آیا اور مولانا زبیر مرحوم سے لے کر اس آدمی تک سند کیسی ہے؟ ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ ندیم صاحب مولانا مرحوم کے لگائے ہوئے درخت پر بیٹھ کر اسے نقصان نہ پہنچائیں، ورنہ دھڑام سے گر جائیں گے، اس سے زیادہ اور کیا عرض کریں......!

مولانا زبیر مرحوم تو محدثین کی نقل اور عدمِ تردید ہی کو دلیل بنا لیتے ہیں، وہ مسئلہ تدلیس میں لکھتے ہیں:

''ابن الصلاح کے اس قول کو اُصولِ حدیث کی بعد والی کتابوں میں بھی نقل کیا گیا ہے اور رتردید نہیں کی گئی، لہٰذا اسے جمہور کی تلقي بالقبول حاصل ہے۔''

(نور العینین، ص: ٤٧٩)

العلل الکبیر سے متعدد حوالے نقل کیے گئے ہیں اور تردید نہیں کی گئی، لہٰذا اسے بھی جمہور کی تلقي بالقبول حاصل ہے!

نیز رقم طراز ہیں:

''اس قول کو حافظ ابن عبدالبر نے نقل کیا اور کوئی رد نہیں کیا، لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ ابن خویز منداد کے شاذ اقوال میں سے نہیں ہے۔ (نیز دیکھیے لسان المیزان: ۲۹۲/۵)۔''

(اہل حدیث ایک صفاتی نام، ص: ۱۷)

باقی رہا ندیم صاحب کا یہ کہنا کہ ''جس طرح کسی محدث کا ضعیف روایت سے استدلال اس کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں، اسی طرح کسی غیر ثابت کتاب سے استدلال یا حوالہ نقل کرنا اس کے ثابت ہونے کی دلیل نہیں ہے۔''

اولاً: ضعیف روایت سے اور کتاب سے استدلال کرنے میں فرق ہے۔ بلاشبہ ضعیف روایت سے استدلال اس کی صحت کی علامت نہیں، سوائے اس کے کہ محدث وضاحت کر دے کہ میں جس روایت سے استدلال کروں گا وہ میرے نزدیک صحیح ہوگی، جیسا کہ امام سفیان ثوری کا موقف ہے۔ (ملاحظہ ہو مقالاتِ اثریہ، ص: ۱۷۴)

یا پھر مصنفینِ صحاح، مثلاً: امام بخاری، امام مسلم، امام ابن خزیمہ اور امام ابن حبان صحاح میں جو روایت درج کر دیں وہ ان کے نزدیک صحیح ہوگی، الا کہ وہ صراحت یا اشارہ کر دیں، جیسا کہ حافظ ابن خزیمہ وضاحت کر دیتے ہیں کہ "وفي القلب منه شيء" یا "إن صح الخبر" وغیرہ۔

محدثین کا کسی کتاب سے نقل کرنا اس کتاب کے معتمد ہونے کی نشانی ہے، جیسا کہ ہم متعدد حوالے مولانا زبیر سے بھی نقل کر چکے ہیں۔ اگر محدثین نقل کرنے کے ساتھ اس کے ناقابلِ اعتبار ہونے کی صراحت بھی کر دیں تو وہ کتاب بلاشبہ غیر ثابت ہوگی، جیسا کہ شیخ ابوعبیدہ نے "کتب حذر منها العلماء" میں صراحت کی ہے۔

ثانیاً: مولانا ندیم صاحب نے ''غیر ثابت کتاب'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو نکتۂ اختلاف ہی نہیں! نکتۂ اختلاف تو یہ ہے کہ کتاب کے ثبوت کے لیے کسوٹی محض اس کی سند ہے یا محدثین کی نقل بھی ہے؟ اگر محض سند ہے تو پھر العلل الکبیر سمیت بہت ساری کتابیں اس معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اگر محدثین کی نقل کی بھی کوئی حیثیت ہے تو ایسی کتب قابلِ اعتماد قرار پاتی ہیں کیوں کہ اُنھوں نے نقل کرنے کے بعد اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

ہم صحتِ کتاب کی شرائط میں ایک شرط ''محدثین کا اس کتاب کا

ذکر کرنا یا اس سے استفادہ کرنا'' بھی نقل کر آئے ہیں، بلکہ العلل الکبیر کی صحت میں ہم نے خشتِ اوّل محدثین کے اعتماد ہی کو بنایا ہے۔

## نقلِ عبارت میں دیانت داری شرط ہے!

مولانا ندیم صاحب لکھتے ہیں:

''خارجی قرائن میں پہلا قرینہ آپ نے یہ درج کیا کہ مولف کے زمانے میں اس کے معاصرین علماء اور تلامذہ میں کتاب معروف نہ ہو......اور یہ مسلّم حقیقت ہے کہ موجودہ العلل الکبیر مولف کے زمانے میں اس کے معاصرین علماء اور تلامذہ میں قطعاً معروف نہ تھی۔''

(ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۳، ۱۳۴)

موصوف کی ''دیانت داری'' ملاحظہ فرمائیں کہ اُنھوں نے راقم الحروف کی نصف عبارت ذکر کر کے باقی سے صرفِ نظر کر لیا ہے اور اس پر پردہ ڈالنے کے لیے کہ یہاں مزید عبارت بھی ہے، ''......'' کا رمز ذکر کر دیا، حالانکہ ہم نے یوں لکھا تھا:

''مولف کے زمانے میں اس کے معاصرین علماء اور تلامذہ میں کتاب معروف نہ ہو اور محدثین اس کی صحت کو مشکوک قرار دیں۔'' (ہفت روزہ الاعتصام، لاہور، جلد: ۶۷، شمارہ: ۲۴، ص: ۲۱۔ جون ۲۰۱۵ء)

مولانا ندیم نے ''محدثین اس کی صحت کو مشکوک قرار دیں'' کی عبارت کو چھپا لیا ہے کیوں کہ وہ محدثین تو کیا کسی ایک محدث سے بھی اس کتاب کا مشکوک ہونا ثابت نہیں کر سکتے، إن شاء اللہ۔ (باقی آئندہ)

## بقیہ: ڈیڑھ ہزار برس پہلے

ہر فرقے نے اپنے طور پر روایات قلم بند کیں۔ کلامِ الٰہی کی طرح حضرت عیسیٰ اور ان کے حواریوں کے ملفوظات اور خطوط کا بھی یہی حشر ہوا۔ اور انجیل کی طرح ان کے مضامین بھی آپس میں سخت مختلف ہو گئے۔ شاہ قسطنطین کی سرپرستی میں نیقیہ میں جو کونسل منعقد ہوئی، تاکہ مختلف فیہ مسائل کا تصفیہ کرے اور عیسائی تعلیمات کا تعین کرے، اس کونسل نے متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی چار انجیلیں تسلیم کیں، باقی کو جعلی قرار دیا۔ ۴۹۶ء میں پوپ گلاسیوس نے بھی باضابطہ طور پر اسے تسلیم کر لیا۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، تاریخ انجیل برکٹ، تاریخ کلیسا یوسیبس بہ حوالہ تاریخ صحف سماوی از پروفیسر نواب علی)

مذکورہ بالا تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ اناجیل نہ کلام الٰہی ہیں نہ حضرت عیسیٰ اور ان کے حواریوں کے مستند ملفوظات ہیں، بلکہ فرقوں اور اشخاص کے خیالات کا مجموعہ ہیں۔ جن میں ممکن ہے کہ کہیں کہیں کلام الٰہی اور ملفوظاتِ عیسوی بھی پائے جاتے ہوں۔ لیکن یہ معلوم کرنا کہ واقعی اللہ کا کلام اور حضرت عیسیٰ کا ملفوظ کون سا ہے، ناممکن ہے۔ لیکن پھر بھی عرصہ تک پادری ہٹ دھرمی سے انھیں لفظاً و معناً کلامِ الٰہی قرار دیتے رہے۔ مگر علم و تحقیق کی روشنی میں ان کی ہٹ دھرمی چل نہ سکی۔ اور بالآخر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ موجودہ اناجیل تاریخی حیثیت سے ناقابلِ اعتبار ہیں اور ان کا اکثر حصہ جعلی ہے۔ (تاریخ صحف سماوی از پروفیسر نواب علی)

سلاطین و پیشوایانِ مذہب، عوام الناس اور کتبِ مقدسہ کے جو حالات اوپر سطور میں بیان کیے جا چکے ہیں ان کے ملاحظے کے بعد مورخین کا یہ بیان حرف بہ حرف صحیح معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک مسیحیت کی جو حالت رہی وہ اس کے لیے باعث ننگ ہے۔ (سیرۃ النبی ﷺ: ۴/ ۱۲۵)

ان حالات میں نہ انسانیت کی کوئی خدمت ممکن تھی اور نہ اصلاحِ حال کا کوئی امکان تھا۔ لوگ سخت پریشان تھے اور بے چینی کے ساتھ ایسے نجات دہندہ کا انتظار کر رہے تھے جو اِن مصائب سے نجات دے اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شمعِ ہدایت روشن کرے۔

(بہ شکریہ پندرہ روزہ اخبار اہلِ حدیث، دہلی: ۱۵ جون ۱۹۵۷ء)

# سندِ کتاب میں منہجی غلطی کا جائزہ

محمد خبیب احمد (ادارہ علوم اثریہ، فیصل آباد)

ذکر کردہ اُصولوں سے کتاب کا اثبات:

موصوف کی ''دیانت داری'' کا دوسرا نمونہ ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

''جو اُصول اُنھوں نے آغازِ مضمون میں بیان کیے ہیں ان میں سے کسی اُصول کو بھی العلل الکبیر اور سوالات آجری کے ثابت کرنے میں پیش نہیں کیا گیا جو اپنے ہی بیان کردہ اُصولوں سے واضح انحراف ہے۔''

(ماہنامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۱)

جنابِ من! ہم نے ''صحتِ کتاب کی شرائط'' کے زیرِ عنوان شرط نمبر تین کے تحت لکھا تھا:

''۳۔ محدثین اپنی تالیفات میں اس کتاب کو مولف کی طرف منسوب کرتے ہوں یا مولف سے جرح وتعدیل کے اقوال نقل کرتے ہوں۔''

اور شرط نمبر سات کے تحت لکھا تھا:

''۷۔ کسی خارجی قرینے سے اس کتاب کی صحت مشکوک نہ ہو۔'' (ہفت روزہ الاعتصام، لاہور، جلد: ۶۷، شمارہ: ۲۴، ص: ۲۱)

ازاں بعد ''پہلی دلیل: محدثین کا اعتماد'' کے عنوان کے تحت اکتالیس محدثین ومحققین کے نام ذکر کیے جو سات صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کیا یہ مذکورہ بالا شرط نمبر تین کے تحت نہیں آتے!

شرط نمبر سات کے تحت کوئی ایسا خارجی قرینہ نہیں جو اِس کی صحت میں شبہ پیدا کرے، اگرچہ یہ کتاب مولف کے زمانے میں معروف نہیں رہی اور محدثین نے اسے مشکوک بھی قرار نہیں دیا۔ آپ پہلے پڑھ آئے ہیں کہ مولانا زبیر علی زئی بھی اسے منسوب کہنے کے باوجود اس سے استدلال کرتے رہے بلکہ اس میں موجود اسانید پر ''إسنادہ صحیح'' کا حکم لگاتے رہے۔

ناچیز نے صحتِ کتاب کی سات شرائط کے علاوہ سات خارجی قرائن بھی ذکر کیے جن میں سے کوئی بھی قرینہ اس کی صحت کو مشکوک قرار نہیں دیتا۔

العلل الکبیر علل الحدیث پر مشتمل ایک کتاب ہے، جو مرتب انداز میں نہیں تھی۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی کتاب سے استفادہ خاصہ مشکل تھا، تبھی ابو طالب قاضی نے اسے فقہی ترتیب پر مرتب کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح حافظ ابن حبان نے صحیح ابن حبان کو پانچ اقسام میں منقسم کیا: قسمِ اول میں اوامر، قسمِ ثانی میں نواہی، قسمِ ثالث میں اخبارِ مصطفیٰ ﷺ، قسمِ رابع میں مباحات اور آخری قسم میں نبیِ کریم ﷺ کے انفرادی افعال کا ذکر ہے۔ پھر ان اقسام میں مختلف انواع ذکر کی ہیں۔ پہلی اور دوسری قسم میں ایک صد دس، تیسری قسم میں اسّی، چوتھی اور پانچویں قسم میں پچاس انواع ذکر کی ہیں۔

سیدھی سی بات ہے کہ ہم ایسے طلبائے علم کے لیے اس کتاب سے استفادہ اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اسی صعوبت کو بھانپ کر امیر علاء الدین علی بن بلبان الفارسی (وفات: ۷۳۹ھ) نے الإحسان لکھی جو بے انتہا مقبول ہوئی۔ اس کے مقابلے میں حافظ ابن حبان کی اصل کتاب (المسند الصحیح علی التقاسیم والأنواع من غیر وجود قطع في سندها ولا ثبوت جرح في ناقلیها یعنی صحیح ابن حبان) دار الکتب العلمیہ، بیروت

نے ۲۰۱۰ء میں پانچ جلدوں میں شائع کی۔ اس کی فہرست نہ ہونے سے کتاب سے استفادہ نہایت مشکل ہو گیا، گویا حافظ ابن حبان کی اصل کتاب ابن بلبان کی ترتیب سے بہت بعد میں شائع ہوئی۔ راقم الحروف نے التقاسیم والأنواع کے حوالے نہایت کم دیکھے ہیں، سبھی "الإحسان" سے نقل کرتے ہیں۔

اب آپ ایک نگاہ عربی لغت پر مشتمل کتب پر بھی ڈالیے جو دبستان تقلیبات سے متعلق ہیں، پھر تقلیبات صوتی پر مشتمل جو کتب ہیں (مثلاً: کتاب العین للفراهیدي، التهذیب للأزهري، المحکم لابن سیده) ان سے استفادہ نہایت مشکل ہے، کیوں کہ ان میں صوتی پہلو کے علاوہ بعید المخرج حروف کی ترتیب کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

الغرض جس کتاب کی ترتیب جتنی مشکل ہوگی اس سے استفادہ کم ہوتا جائے گا اور اس کی شہرت بھی نہیں ہوگی۔ بعینہٖ العلل الکبیر کا معاملہ معلوم ہوتا ہے کہ ابو طالب قاضی کی ترتیب کے بعد اس سے استفادہ آسان ہو گیا۔

جن قدماء نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے، کیا اس کی کوئی اہمیت نہیں؟ جواب دینے سے پہلے مولانا مرحوم کی دو عبارتیں پڑھ لیں۔

مولانا زبیر مرحوم أخبار الفقهاء والمحدثین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''معاصرین میں سے عمر رضا کحالہ اور خیر الدین زرکلی نے بھی اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ جدید دور کے یہ حوالے اس کی قطعی دلیل نہیں ہیں کہ یہ کتاب محمد بن حارث کی ہی ہے۔ قدیم علماء نے اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں کیا۔''

(فتاویٰ علمیہ: ۱/ ۳۵۹)

ایک اور مقام پر الفقه الأکبر (المکذوب علی الشافعي) کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''امام شافعی کے شاگردوں اور متقدمین، مثلاً: امام بیہقی وغیرہ نے اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں کیا۔'' (فتاویٰ علمیہ: ۱/ ۱۳۶)

معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک کسی کتاب کو متقدمین ذکر کریں تو یہ اُس کی صحت کے لیے نفع مند ہے۔ سوال یہ ہے کہ العلل الکبیر میں ایسا کیوں نہیں!

## ''موافقت'' کے نادر نمونے:

ندیم صاحب لکھتے ہیں:

> ''آپ نے علمی دھونس جمانے کے لیے امام بیہقی سے لے کر اپنے معاصر تک حوالے نقل کر دیے جو بالکل بے سود ہیں، کیوں کہ ان میں سے اکثر کی بنیاد امام بیہقی ہیں۔''

(ماہنامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۵)

اس فقیر پر علمی دھونس کی پھبتی موصوف کو جچتی نہیں کیوں کہ وہ خود شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر سنگ باری کر رہے ہیں۔ ہم انھیں مولانا زبیر مرحوم کی ''موافقت'' کے نادر نمونے دکھاتے ہیں۔

امام شافعی نے مسئلہ تدلیس کے بارے میں فرمایا:

> ''جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس نے ایک دفعہ تدلیس کی ہے تو اس نے اپنی پوشیدہ بات ہمارے سامنے ظاہر کر دی۔'' (الرسالة: ۱۰۳۳ نیز دیکھیے: ۱۰۳۵)

اب ملاحظہ کیجیے کہ مولانا زبیر نے امام شافعی کی ''موافقت'' کرنے والے کون کون سے ذکر کیے ہیں:

① ۔ امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ نے امام شافعی کی کتاب الرسالة کو پسند کیا اور کوئی ردّ نہیں کیا، لہٰذا مسئلہ تدلیس میں وہ امام شافعی کے ہم نوا ہیں۔

② ۔ امام شافعی کے قول کو درج ذیل محدثین نے ذکر کیا ہے:

۱: امام بیہقی ۲: حافظ ابن الصلاح ۳: حافظ سیوطی

۴: حسین بن عبداللہ الطیبي

لہٰذا یہ بھی موافق ہوئے!

③ ۔ حافظ ابن الصلاح نے امام شافعی کا قول ذکر کیا ہے۔ اور

بعد میں محدثین نے اپنی کتب میں بدونِ نقد نقل کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

۱:امام ابن الملقن ۲:حافظ ابن کثیر ۳:علامہ بلقیني
۴:علامہ آبناسی۔

* حافظ عراقی نے ذکر کیا ہے کہ امام شافعی نے اسے اس مدلس کے لیے ثابت قرار دیا ہے جو ایک دفعہ تدلیس کرے۔ علامہ زکریا انصاری نے حافظ عراقی کا قول نقل کیا ہے۔

* علامہ ابوبکر صیرفی نے الرسالة کی شرح میں امام شافعی کے قول کی شرح کی ہے، لہٰذا وہ بھی موافقین امام شافعی میں سے ہیں۔

* حافظ ابن حجر کا قول امیر یمانی نے ذکر کیا ہے اور کوئی تردید نہیں کی۔ (دیکھیے نور العینین، ص:۴۷۵-۴۸۶)

راقم الحروف اس ''موافقت'' کی قلعی کھول چکا ہے۔ (دیکھیے مقالاتِ اثریہ، ص:۳۰۵-۳۰۹)

سوال صرف یہ ہے کہ امام شافعی کے قول کو محدثین نقل کریں، حافظ ابن الصلاح سے مقدمہ ابن الصلاح کے شارحین نقل کریں، حافظ عراقی کا قول حافظ زکریا انصاری اور حافظ ابن حجر کا قول امیر یمانی نقل کریں تو ''موافقت'' اور ''جمہور کا مذہب'' قرار پائے۔ اور اگر العلل الکبیر کا حوالہ امام بیہقی نقل کریں اور بہ فرض تسلیم ان سے محدثین کا انبوہ کثیر نقل کرے تو کیوں ''علمی دھونس'' کی پھبتی کسی جائے!

**ثانیاً**: ہم عرض کر آئے ہیں کہ حافظ ابن حبان کی کتاب الصلاۃ کے اثبات کے لیے مولانا زبیر نے چھ محدثین وفقہاء کے اقوال نقل کیے ہیں، کیا یہ ''علمی دھونس'' نہیں؟

مولانا کے نزدیک تو ''موافقت'' کا دائرہ ہی بڑا وسیع ہے، لہٰذا اُن کے تلمیذ رشید کو اس پر چیں بہ جبیں نہیں ہونا چاہیے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ندیم صاحب نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اکثر کی بنیاد امام بیہقی ہیں، یعنی بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے براہِ راست العلل الکبیر سے نقل کیا ہے۔ ان کی اس نقل اور کتاب پر اعتماد کا کیا بنے گا؟

### ''لم یعرفه'' اور ''منکر'' ہم معنی ہیں:

مولانا ندیم ظہیر لکھتے ہیں:

''متصادم کی مثال حاضر ہے: امام ترمذی نے حدیث: ((من صنع إلیه معروف......إلخ.)) کے بارے میں فرمایا: ''وسألت محمدًا فلم یعرفه:'' ''میں نے (اس سے متعلق) امام محمد بن اسماعیل البخاری سے پوچھا تو اُنھوں نے اسے پہچانا ہی نہیں۔'' یعنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جب کہ العلل الکبیر (۱/۳۱۵) میں منقول ہے کہ ''وسألت محمدا عن هذا الحدیث، فقال: هذا منکر:'' یعنی میں نے اس حدیث کے بارے میں امام بخاری سے پوچھا تو اُنھوں نے فرمایا: یہ منکر ہے۔''

(ماہنامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ:۱۲۹-۱۳۲، ص:۱۳۵)

مولانا کے نزدیک امام بخاری کے دونوں اقوال متصادم ہیں۔ حالانکہ دونوں ہم معنی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالفتاح ابوغدہ لکھتے ہیں:

''محدثین کا یہ کہنا: لا أعرفه، لم أعرفه، لم أقف علیه، لاأعرف له أصلاً، لم أجد له أصلا، لم أقف له علی أصل، لا أعرفه بهذا اللفظ، لم أره بهذا اللفظ، لم أجده، لم أجده هکذا، لم یردفیه شيء، لا یعلم من أخرجه ولا إسناده جیسی عبارات معروف حفاظ میں سے کسی ایک سے صادر ہوں، کسی نے ان کا تعاقب نہ کیا ہو تو اس حدیث پر وضع کا حکم لگانے کے لیے یہی کافی ہے۔''

(مقدمہ تحقیق المصنوع في معرفة الحدیث الموضوع للملا علي القاري، ص:۸، ۹)

ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ قول سید عبدالماجد الغوري نے بھی

ذکر کیا ہے۔(ملاحظہ ہو معجم ألفاظ وعبارات الجرح والتعديل المشهورة والنادرة، ص:۵۲۰، معجم المصطلحات الحديثية،ص:۵۸۹)

علامہ ابن عراق لکھتے ہیں:

''وہ حفاظ جن کا ذکر اُنھوں نے (حافظ علائی) نے کیا ہے اوران جیسے دیگر حفاظ اگر کسی حدیث کے بارے میں یہ کہہ دیں:''لا أعرفه، لا أصل له'' تو اُس پر موضوع حدیث کا لیبل لگانے کے لیے یہی کافی ہے۔'' (مقدمہ تنزيه الشريعة المرفوعة لابن عراق، ص:۸)

حافظ علائی نے جو کبار اہلِ علم ذکر کیے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔امام احمد ۲۔امام علی بن مدینی ۳۔امام یحییٰ بن معین ۴۔امام بخاری ۵۔امام ابوحاتم الرازی ۶۔امام ابوزرعہ الرازی ۷۔امام نسائی ۸۔امام دارقطنی

حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

''جب باخبر حافظ اور ناقدِ فن کسی حدیث کے بارے میں کہہ دے:''لا أعرفه'' تو اس قول کی بنیاد پر اُس کی نفی کی جائے گی ،جیسا کہ شیخ الاسلام (حافظ ابن حجر) نے ذکر کیا ہے۔''

(تدريب الراوي:۱/۲۹۶،۲۹۷)

سید عبدالماجد الغوري نے ''المنکر'' کی لغوی تعریف یوں کی ہے:

''اسم مفعول من أنكر، بمعنى: جحده أو لم يعرفه.'' (معجم المصطلحات الحديثية، ص: ۷۹۰)

''المنکر ،أنکر کا اسم مفعول ہے جس کے معنی ہیں :اس نے اس کا انکار کیا یا اسے پہچانا نہیں۔''

اُنھوں نے المنکر کے اصطلاحی معنی میں متعدد اقوال ذکر کیے ہیں۔

ان اقوال سے معلوم ہوا کہ امام بخاری کا کسی حدیث کو نہ پہچاننا اس کے منکر ہونے کی دلیل ہے۔عدمِ شناخت لغوی معنوں میں نہیں بلکہ اصطلاحی معنوں میں ہے۔ترتيب العلل الكبير (۱/۱۱۷) میں امام بخاری کا کلام ملاحظہ ہو:

''یہ منکر ہے۔سُعیر بن خِمس قلیل الحدیث ہے اور راوی اس سے مناکیر بیان کرتے ہیں۔''

اس کی تضعیف کرنے والے دیگر ناقدینِ فن کی آرا بھی امام بخاری کے قول سے مماثلت رکھتی ہیں:

① ......امام ابوحاتم نے فرمایا:

''یہ حدیث اس سند سے منکر ہے۔''(العلل:۲۵۷۰)

بلکہ اُنھوں نے یہاں تک فرمایا ہے:

''یہ حدیث میرے نزدیک اس سند سے موضوع ہے۔''

(العلل:۲۱۹۷)

② ......امام بزار لکھتے ہیں:

''اس حدیث کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ سلیمان تیمی سے سعیر کے علاوہ کسی نے روایت کی ہو۔اور نہ سعیر سے أحوص بن جواب کے علاوہ کوئی روایت کرتا ہے۔''

(مسند البزار: ۷/۵۵)

امام ترمذی نے اسے کم از کم ''حسن غريب'' کہا ہے۔بعض مراجع میں ''حسن صحيح غريب'' مذکور ہے۔تفصیل کسی اور مقام پر آئے گی،إن شاء الله .

## دونوں کتب میں ''مقارب الحديث'' ہے:

ندیم صاحب نے متصادم کی دوسری مثال یوں ذکر کی ہے:

''سنن الترمذي (۱۷۲۶) میں سیف بن ہارون کو ''مقارب الحديث'' لکھا ہے، جب کہ العلل الكبير (۱/۲۶۳) میں اسے ''له مناكير'' سے متصف کیا

گیا ہے۔اس طرح کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ والحمد للّٰہ . ''(ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث،شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲،ص:۱۳۵)

یہاں موصوف نے نہایت چابک دستی کا مظاہرہ کیا ہے حالانکہ جو روایت جامع ترمذی میں ہے وہی العلل الکبیر میں ہے۔امام ترمذی نے امام بخاری سے اسی حدیث کے تحت سیف بن ہارون کے بارے میں "مقارب الحدیث "کی تعدیل نقل کی ہے۔دونوں کتب کی عبارتیں ملاحظہ کرنے کے بعد تقابل کیجیے:

❶......جامع ترمذي: كتاب اللباس، باب ماجاء في لبس الفراء، رقم: ١٧٢٦:

"١: وسألت البخاري عن هذا الحديث فقال: ما أراه محفوظا، روى سفيان عن سليمان التيمي عن أبي عثمان عن سلمان موقوفا.

٢: قال البخاري: وسيف بن هارون مقارب الحديث وسيف بن محمد عن عاصم ذاهب الحديث."

❷......اب اسی حدیث(( الحلال ماأحل الله في كتاب ......إلخ)) کے تحت العلل الکبیر (أبواب اللباس، باب ماجاء في لبس الفراء:۲/۲۲،۲۷، رقم الباب: ۳۰۳) کی عبارت ملاحظہ کیجیے:

"١: سألت محمدًا عن هذا الحديث فقال: ما أراه محفوظاً، روى سفيان بن عيينة عن سليمان التيمي عن أبي عثمان عن سلمان هذا الحديث موقوفًا.

٢: قال محمد: وسيف بن هارون مقارب الحديث و محمد بن جابر ذاهب الحديث."

قارئین کرام! آپ نے غور فرمایا کہ امام ترمذی کی دونوں کتابوں میں تقریباً یکساں عبارت ہے جو ہمارے دعوے کی دلیل ہے کہ العلل الکبیر امام ترمذی ہی کی تصنیف ہے۔

باقی رہا امام بخاری کا سنن ترمذی میں سیف بن محمد عن عاصم کو "ذاهب الحديث" اور العلل الکبیر میں محمد بن جابر کو "ذاهب الحديث "کہنا تو اس حوالے سے عرض ہے کہ ناقدینِ فن مختلف مقامات پر اَحادیث کی علل اور راویوں کے ضعف کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں۔یہاں بھی یہی صورت معلوم ہوتی ہے کہ ترمذی میں سیف بن محمد کو اور العلل الکبیر میں محمد بن جابر کو "ذاهب الحديث "قرار دیا ہے۔

سیف بن محمد عن عاصم کی سند کہاں ہے،ہمیں بسیار تتبع کے بعد بھی نہیں ملی!

سیف بن محمد کے بارے میں امام بخاری نے کہا: "لا يتابع عليه." (التاريخ الكبير:۴/۱۷۲،رقم:۲۳۸۰)،علامہ مغلطائي نے امام بخاری سے "لا يتابع عليه، هو ذاهب الحديث"نقل کیا ہے۔(إكمال تهذيب الكمال: ٦/ ١٩٥)

حافظ ابن حجر نے بھی علامہ مغلطائي سے اسی طرح نقل کیا ہے۔(تهذيب التهذيب: ٤/ ٢٩٧)

تقريب التهذيب (۲۷۱۷) میں محدثین کے اقوال کا خلاصہ یوں ذکر کیا ہے:"كذبوه. "(ان محدثین نے اسے جھوٹا کہا ہے)

گویا علامہ مغلطائي نے ترمذی اور التاريخ الكبير للبخاري کے الفاظ کو یک جا کر دیا ہے۔اب اگر کوئی دعویٰ کردے

کہ "ھو ذاھب الحدیث" کے الفاظ التاریخ الکبیر کے مطبوعہ نسخے میں نہیں ہیں، لہٰذا موجودہ نسخہ بھی مشکوک ٹھہرا! یا مغلطائی کی کتاب مشکوک ہوگئی! تو......؟

بعینہٖ دعویٰ ہمارے کرم فرما ندیم صاحب نے کر دیا کہ امام بیہقی کے العلل الکبیر سے نقل کردہ اقوال العلل میں نہیں، لہٰذا العلل کا مطبوعہ نسخہ مشکوک ہے۔ (ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۴)

ایسی ''تحقیق انیق'' پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے! اختلافِ نسخ کا ادنیٰ سا درک رکھنے والا طالبِ علم بھی اس سے بہ خوبی واقف ہے کہ نسخوں کا اختلاف کتاب کی صحت کو مشکوک نہیں کرتا، ورنہ ایسے طرزِ عمل اور سطحی تحقیق سے ذخیرۂ حدیث محفوظ نہیں رہ سکے گا!

العلل الکبیر میں امام بخاری نے جس محمد بن جابر کو "ذاھب الحدیث" کہا ہے، اس کی روایت کہاں ہے اور وہ کون ہے؟ اس راوی کی روایت نہیں مل سکی، ممکن ہے وہ محمد بن جابر الیمانی السحیمي ہو۔ کیوں کہ العلل میں وہ بدونِ نسبت مذکور ہے۔ امام بخاری نے اس کے بارے میں فرمایا:

❁......"لیس بالقوي." (التاریخ الکبیر: ۱/ ۵۳، ترجمة: ۱۱۱)

❁......"لیس بالقوي عندھم." (الضعفاء الصغیر، ص: ۹۵، رقم: ۳۲۳. تحفة الأقویاء)

❁......"یتکلمون فیه." (التاریخ الأوسط: ٤/ ٦٦٨، ترجمة: ١٠٣٤)

❁......"لیس بالقوي، یتکلمون فیه، روی مناکیر." (تھذیب الکمال للمزي: ١٦/ ١٦٣، تھذیب التھذیب: ٩/ ٨٩)

اس راوی کے بارے میں امام بخاری کی جرح "روی مناکیر" امام مزی نے کہاں سے نقل کی ہے، اُنھوں نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی۔ اور امام بخاری کی کتابوں میں محمد بن جابر کے ترجمے میں بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ ندیم صاحب یہاں یہ دعویٰ کر دیں کہ امام بخاری کی کتابوں کی نسبت بھی مشکوک ہے کیوں کہ حافظ مزی اور حافظ ابن حجر کا ذکر کردہ قول ان میں نہیں!

ملحوظ رہے کہ ناقدینِ فن راوی کی توثیق و تجریح غیر محل پر بھی ذکر کر دیتے ہیں، حفاظِ دنیا اور کتب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والے ان تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

مذکورہ بالا حدیث اور اس کے شواہد کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تحقیق و حاشیہ سنن سعید بن منصور (۲/ ۳۲۰_۳۳۰، حدیث: ۹۴)، تنبیه الھاجد لأبي إسحاق الحویني (۴/ ۱۳۹-۱۴۳، حدیث: ۱۱۶۲، ۱۱۶۳)۔

## دونوں اصطلاحات میں جمع و توفیق ممکن ہے:

مولانا ندیم ظہیر صاحب نے ذکر کیا کہ امام بخاری نے سیف بن ہارون کو جامع ترمذی میں "مقارب الحدیث" جب کہ العلل الکبیر میں "له مناکیر" کہا ہے۔ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں کہ جامع ترمذی اور العلل الکبیر میں اس راوی کی ایک ہی روایت کے ضمن میں اسے ''مقارب الحدیث'' کہا ہے، جب کہ العلل الکبیر میں اس کی دوسری روایت کے تحت اس کے بارے میں "له مناکیر" کی جرح کی ہے۔

العلل الکبیر (۲/ ۶۸۰، ۶۸۱) میں حضرت جریر بن عبداللہ البجلي رضی اللہ عنہ سے اس کی حدیث اور امام بخاری کی جرح موجود ہے، جب کہ امام ترمذی نے سنن ترمذی، حدیث: ۱۵۹۱ کے تحت "وفي

الباب" میں حضرت جریر کی حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی روایت ذکر نہیں کی اور نہ امام بخاری کا قول ذکر کیا ہے۔

**ثانیاً**: "مقارب الحدیث" اور "لہ مناکیر" دو ایسی اصطلاحات نہیں کہ جن میں جمع وتوفیق ممکن نہ ہو۔ "مقارب الحدیث" کے معنی ہیں کہ اس کی حدیث دوسرے ثقہ راویوں کی حدیث کے قریب ہے یا دیگر رواۃ کی حدیث اس کی حدیث کے قریب ہے۔ یہ ایسا درمیانی درجہ ہے جو حدِ سقوط تک پہنچتا ہے اور نہ اس راوی کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ اس اصطلاح کا شمار عموماً الفاظِ تعدیل میں ہوتا ہے۔

"لہ مناکیر" کا مطلب ہے کہ اس نے منکر احادیث بیان کی ہیں۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ اس کی ساری روایات مسترد کر دی جائیں گی۔ علامہ عبدالحی لکھنوی نے اس قسم کے الفاظ کو قابلِ اعتبار جرح میں شمار نہیں کیا۔ (الرفع والتکمیل، ص:۲۱۰)

حافظ سخاوی ان الفاظ کو ضعف کے درجۂ خامسہ (ہلکے ضعف) میں لائے ہیں۔ اس درجے میں وہ "منکر الحدیث" راوی کو بھی لائے ہیں۔ (فتح المغیث:۲/۱۲۳) جو درست نہیں کیوں کہ "منکر الحدیث" کی حدیث ضعیف ہوتی ہے۔ اور "لہ مناکیر" میں تفردات مراد ہوتے ہیں جو کبھی باعثِ جرح ہوتے ہیں اور اکثر نہیں ہوتے۔ حافظ ابن حجر نے صحیحین بلکہ کتبِ ستہ کے راوی ابوبکر عبدالسلام بن حرب النھدي الملائي الكوفي کے بارے میں لکھا ہے:

"ثقة حافظ، له مناكير." (التقريب: ٤٠٥٧)

مولانا ابوالاشبال احمد شاغف لکھتے ہیں:

''اس راوی کی صحیح بخاری میں دو حدیثیں ہیں: ایک مغازي میں ہے اور دوسری طلاق میں متابعتاً ہے۔'' (ضياء الباري لمعرفة رجال صحيح البخاري، ص:۱۲۰، ترجمہ:۸۷۷، قرۃ العینین في معرفة رجال الصحیحین، ص:۲۰۲، ترجمہ:۱۲۹۰)

ابراہیم بن عبدالرحمان بن مہدی بصری کے بارے میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

"صدوق له مناكير." (التقريب: ۲۳۳)

اس لیے امام بخاری کا "مقارب الحدیث" اور "لہ مناکیر" کہنے میں کوئی ایسا تعارض نہیں جس میں تطبیق ممکن نہ ہو سکے۔ اور اس سے کتاب العلل کی صحت بھی مشکوک نہیں ہوتی۔ اگر تعارض ہوتا بھی تو اسے تعددِ اجتہاد پر محمول کیا جانا چاہیے تھا۔ امام بخاری نے کتاب الضعفاء میں صلت بن بہرام کو ذکر کیا اور اس پر إرجاء اور "لا يصح حديثه" کی جرح کی، جس پر مولانا زبیر نے یوں تعلیق لکھی:

''ثقہ ہے۔ میرے خیال کے مطابق امام بخاری نے اسے مرجئ ہونے کی وجہ سے الضعفاء میں ذکر کیا ہے، پھر اُسے دوسرے نسخے میں حذف کر دیا ہے اور (التاریخ) الکبیر میں بغیر کسی جرح کے ذکر کیا ہے۔''

(تحفة الأقوياء، ص:۵۵)

گویا امام بخاری کا اجتہاد تغیر ہو گیا، جیسا کہ دیگر اہلِ علم کا اسلوب ہے کہ وہ تغلیط کے بجائے جمع وتوفیق کی کوشش کرتے ہیں۔

باقی رہا مولانا ندیم صاحب کا یہ دعویٰ کہ ''اس طرح کی بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، والحمد للہ'' تو اُن سے گزارش ہے کہ ایسی مثالیں قارئین کے سامنے پیش کرنے میں بخل سا سے کام نہ لیں بلکہ حق کو نکھارنے کے لیے انھیں ضرور ذکر کریں، تاکہ ہمارے لیے بھی ان پر تبصرہ کرنے کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے۔ (باقی آئندہ)

❀❀❀

تحقیق وتنقید

قسط نمبر ⑦ آخری

# سندِ کتاب میں منہجی غلطی کا جائزہ

محمد خبیب احمد (ادارہ علوم اثریہ، فیصل آباد)

## دیگر مغالطات کا جائزہ:

✽......ندیم صاحب رقم طراز ہیں:

''اگر یہ اب بھی گمشدہ ہی ہے تو ثابت کیوں کر ہوگئی!''

(ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۴)

بلاشبہ امام ترمذی کی اپنی تصنیف شدہ کتاب اب بھی مفقود کتب میں شمار ہوتی ہے، البتہ اس کی ترتیب موجود ہے جسے توسعاً ''العلل الکبیر للترمذي'' ہی کہا جاتا ہے۔ اکثر محدثین بھی اسے یوں ہی ذکر کرتے ہیں۔ علامہ ابن بلبان کی مرتب کردہ کتاب کو صحیح ابن حبان ہی کہا جاتا ہے۔ قیام اللیل، قیام رمضان اور کتاب الوتر تینوں کتب ہی امام ابو عبداللہ محمد بن نصر المروزي (وفات: ۲۹۴ھ) کی ہیں، جو مفقود ہیں۔ علامہ احمد بن علی المقریزي (وفات: ۸۴۵ھ) نے ان کا اختصار کیا جو مطبوع اور متداول ہے۔ علمائے کرام ان تینوں رسائل سے استدلال کرتے اور امام مروزی کے اقوال بھی بلا جھجک نقل کرتے ہیں۔ شاید کسی اور عالم کا حوالہ مولانا ندیم کے لیے قابلِ اعتماد نہ ہو، اس لیے ہم مولانا زبیر علی زئی رحمہ اللہ کا حوالہ پیش کیے دیتے ہیں۔ انھوں نے متعدد مقامات پر قیام اللیل للمروزي کی صراحت کرنے کے بعد علامہ مقریزی کے اختصار کا حوالہ دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تعداد رکعات قیام رمضان کا تحقیقی جائزہ، ص: ۲۲، ۳۲)

بعض مقامات پر مختصر قیام اللیل یا مختصر قیام اللیل للمروزي لکھا۔ (تعداد رکعات، ص: ۷۷، ۸۵، ۸۹، ۹۰، ۹۵)

قیام اللیل للمروزي کا ایک حوالہ فیض الباري سے نقل کیا ہے۔ (تعداد رکعات، ص: ۱۸)

اس لیے جب اس قسم کی کتابوں کا حوالہ دیا جائے تو اس سے مراد معروف اور متداول کتابیں ہوتی ہیں۔ اگر مقریزی کے اختصار کے باوجود وہ کتاب امام مروزی کی رہتی ہے تو ابو طالب کی ترتیب کے بعد یہ کتاب امام ترمذی کی کیوں نہیں رہتی! اس لیے یہ اعتراض نہایت سطحی سا ہے۔

محدثین اپنے اساتذہ کی کتب کا جو انتقاء، انتخاب یا تخریج کرتے ہیں یا محدث کے رجسٹر میں بکھری ہوئی احادیث، مرویات، مسموعات اور مشائخ کو ترتیب سے ذکر کر کے اس کا نام ثبت رکھتے ہیں، سب مشکوک ہو جائیں گی۔

ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ ''منتخب کو اصل پر ترجیح نہیں دی جا سکتی'' تو مولانا زبیر نے یوں جواب دیا:

''اگر حافظ صاحب کو عبد بن حمید کی المسند الکبیر کا نسخہ کہیں سے مل گیا ہے تو وہ پیش کریں، ورنہ منتخب مسند عبد بن حمید مطبوع و مخطوط مصور ہمارے پاس موجود ہے......الخ۔''

(تحقیقی مقالات: ۲/ ۴۱۷)

اس لیے مولانا ندیم کا یہ اعتراض کہ ''اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ وہی العلل ہے جو امام بیہقی کے پاس تھی......الخ'' (ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۴) نہایت عامیانہ ہے۔

بلکہ اس ''اصول'' سے جامع ترمذی کی صحت بھی دھندلا جاتی ہے۔ ڈاکٹر خالد بن منصور الدریس رقم طراز ہیں:

''امام بخاری سے جتنی بھی تحسینات (احادیث یا راویات کو حسن کہنا) منقول ہیں، سبھی کا مصدر امام ترمذی کی دو

کتب ہیں: ایک العلل الکبیر اور دوسری جامع ترمذی۔ اس (جامع) میں نصوص العلل الکبیر سے کہیں زیادہ ہیں۔

مجھے چار ایسی نصوص ملی ہیں جن میں امام ترمذی نے امام بخاری کی تحسین نقل کی ہے مگر مجھے وہ العلل الکبیر اور جامع ترمذی میں نہیں ملیں۔ ان میں سے پہلی معرفۃ السنن والآثار، دوسری تہذیب الکمال، تیسری معرفۃ السنن للبیھقي اور چوتھی السنن الکبریٰ میں ہے۔ میں نے انھیں بھی دیگر نصوص میں شامل کیا ہے کیوں کہ ان دونوں کتب کی صحت کو عیب دار یا مشکوک قرار دینے والی کوئی چیز نہیں، کیوں کہ جامع ترمذی کی ایسی روایت جس پر ہم نے اطلاع نہیں پائی، میں ان نصوص کی موجودگی کا قوی احتمال ہے یا پھر یہ نصوص العلل الکبیر کے کسی ایسے نسخے میں ہوں جن پر ابو طالب القاضی مطلع نہیں ہو پائے۔ انھوں نے کتاب العلل کو ابواب کے مطابق ڈھالا ہے۔ ان کی ترتیب شدہ کتاب ہی متداول ہے۔ ہمیں اصل کتاب کی موجودگی کا کچھ علم نہیں۔''

(الحدیث الحسن لذاتہ و لغیرہ: ۱/۳۹۸، ۳۹۹)

✽......ندیم صاحب لکھتے ہیں:

''جس سند میں مجہول راوی ہو وہ سند کبھی صحیح یا حسن نہیں ہو سکتی۔'' (ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۳)

یہ نکتۂ اختلاف ہی نہیں، تسلیم شدہ باتوں کو تسلیم کروانا بلاشبہ بڑے لوگوں کا کام ہے۔ ہم نے پورے مضمون میں کہیں بھی اس کتاب کی سند کو حسن یا صحیح نہیں کہا بلکہ ہم نے پہلی دلیل ''محدثین کا اعتماد'' ذکر کی ہے۔ جس کا کوئی معتبر جواب مولانا نہیں دے سکے۔

**کتاب سے نقل اور کتاب کو روایت کرنے میں فرق ہے:**

ندیم ظہیر صاحب لکھتے ہیں:

''آپ نے جس محدث کو بہ طورِ دلیل پیش کیا ہے وہ امام بیہقی ہیں جو نہ امام ترمذی کے معاصر ہیں اور نہ تلامذہ میں سے ہیں۔ جب کہ امام ترمذی ان سے تقریباً ۱۷۹ سال پہلے (۲۷۹ھ) میں فوت ہو چکے تھے۔ ۱۷۹ سالہ دور میں موجود العلل الکبیر کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔''

(ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۴)

موصوف کے مبلغِ علم کا عالَم یہ ہے کہ وہ کتاب سے نقل کرنے اور کتاب روایت کرنے کا فرق ہی نہیں سمجھ پائے۔ امام بیہقی نے العلل الکبیر سے نقل کیا ہے، اسے روایت نہیں کیا، جیسا کہ ندیم صاحب نے بھی اسی مضمون میں ترمذی اور فتح الباری کے حوالے دیے ہیں، ان کے مولفین اور مولانا موصوف میں اتنی دوری ہے کہ ''مسافروں کی گردنیں ٹوٹ جائیں۔''

باقی رہا (۱۷۹) سال اس کتاب کا نام و نشان نہ ملنا تو یہ اس کے غیر معتبر ہونے کی دلیل نہیں۔ ہم عرض کر آئے ہیں کہ بکھرے مواد پر مشتمل کتب سے استفادہ مشکل ہوتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس (۱۷۹) سالہ دور میں کسی محدث نے اس کا انکار کیا! جس زمانے میں قلم اور دوات سے کتابت ہوتی تھی، ظاہر بات ہے کہ اس زمانے میں کتابیں اتنی متداول نہیں تھیں جتنی آج ہیں۔

**ثانیًا:** اگر یہ کتاب خطأً یا عمداً امام ترمذی کی طرف منسوب ہو گئی ہے تو اس کا سبب کون ہے؟ کیا کوئی نام پیش کیا جا سکتا ہے؟

**ثالثًا:** قاضی ابو طالب کی ترتیب سے پہلے امام بیہقی کے علاوہ امام ابن عبد البر اور حافظ ابن عساکر نے جو اقوال نقل کیے ہیں، کیا شیخ زبیر کے منہج کے مطابق کم از کم وہ امام بیہقی کی موافقت نہیں!

**رابعًا:** یہ کتاب اگر امام ترمذی کی نہیں تو اس کا حقیقی مولف کون ہے؟

**خامسًا:** کتاب کے مخطوط پر کتاب کا نام غلط ہے!

کتاب سے روایت (نقل) کرنے کے بارے میں مولانا زبیر مرحوم کا موقف دیکھیے:

''یہ کتاب سے روایت ہے اور کتاب سے روایت اصولِ

حدیث کی رُو سے جائز ہے۔'' (نور العینین، ص:۴۱۶)

علامہ زرکشی (وفات:۷۹۴ھ) نے علامہ ابو بکر صیرفی (وفات: ۳۳۰ھ) کی کتاب الدلائل و الأعلام سے ایک قول نقل کیا اور اس پر شیخ نے یوں تبصرہ کیا:

''تنبیہ: چونکہ کتاب الدلائل و الأعلام میرے پاس موجود نہیں اور نہ مجھ اس کے وجود کا کوئی علم ہے، لہٰذا یہ حوالہ مجبوراً زرکشی سے لیا ہے اور دوسرے علماء نے بھی صیرفی سے اس حوالے کو نقل کیا ہے، مثلاً: دیکھیے شرح ألفیة العراقي بالتبصرة و التذکرة (١/ ١٨٣، ١٨٤) نیز یہ کہ کتاب سے روایت جائز ہے، الا یہ کہ اصل کتاب میں طعن ثابت ہو تو پھر جائز نہیں ہے۔''

(نور العینین، ص:۴۸۵)

جب کہ کتاب سے نقل کرنے میں شیخ کا منہج نہایت عجیب ہے۔ امام عبدالعزیز الدراوردي المدني کے بارے میں جرح نقل کرتے ہوئے امام ساجی کا قول تهذیب التهذیب (۶/۳۱۶) سے وہ نقل کرتے ہیں اور اس پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''یہ حوالہ بے سند ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے اسے ساجی کی کتاب الضعفاء سے نقل کیا ہو، واللہ اعلم۔''

(فتاویٰ علمیہ:۲/۳۵۳)

مگر جب یحییٰ بن سلیم الطائفي کا جرح وتعدیل کے اعتبار سے جائزہ لیا تو امام ساجی کا قول جرح میں بھی نقل کیا اور تعدیل میں بھی، جب کہ اس کا مرجع بھی تهذیب التهذیب ہے!

پہلے صفحے پر امام ساجی کی طرف سے تعدیل نقل کی۔ (فتاویٰ علمیہ:۲/ ۴۱۷، صحیح بخاری کا دفاع، ص:۳۳۶) اور اگلے صفحے پر جرح نقل کی۔ (فتاویٰ علمیہ:۲/ ۴۱۸، صحیح بخاری کا دفاع، ص:۳۳۷)

یعنی انھوں نے امام ساجی کے قول کی ایک جگہ تردید کی اور دو مقامات پر استدلال کیا۔

❁......مولانا زبیر علی زئی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''جس شخص کا جو قول بھی پیش کیا جائے اس کا صحیح وثابت ہونا ضروری ہے۔ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ یہ فلاں کتاب، مثلاً: تہذیب الکمال، میزان الاعتدال یا تهذیب التهذیب وغیرہ میں لکھا ہوا ہے بلکہ اس کے ثبوت کے بعد ہی اسے بہ طورِ جزم پیش کرنا چاہیے۔'' (مقدمۂ تحقیق موطأ، ص: ۵۵، ماہ نامہ الحدیث، شمارہ:۳۴، ص:۳)

جب کہ وہ حافظ ابن حجر سے امام حاکم کا قول ''و اتفاق الشیخین علیه یقوي أمره'' تهذیب التهذیب سے نقل بھی کررہے ہیں! (تحقیقی مقالات:۴/۳۶۹)

سوال یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے امام حاکم کا قول ان کی کس کتاب سے لیا ہے؟ اور یہاں تهذیب التهذیب کی عبارت معتبر کیوں ہے؟ راقم السطور نے امام حاکم کا قول ان کی متعدد کتب (المستدرك، معرفة علوم الحدیث، المدخل إلی الصحیح اور المدخل إلی معرفة کتاب الإکلیل) میں تلاش کیا مگر کامیابی نہ ہوسکی۔ تاہم المدخل إلی الصحیح (۴/۱۵۵، ۱۵۶) میں اس سے ملتا جلتا قول امام نسائی سے امام حاکم نے نقل کیا ہے۔ ممکن ہے کہ حافظ ابن حجر نے علامہ مغلطائی سے نقل کیا ہو۔ اور اکمال تہذیب الکمال کا متعلقہ حصہ مفقود ہے۔

❁......مولانا ندیم لکھتے ہیں:

''حدیث کی صحت وضعف کی بنیاد علم جرح وتعدیل اور اسماء الرجال پر ہے، لہٰذا اس سلسلے میں جب تک وہی احتیاط اختیار نہیں کی جائے گی جو کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینے کے وقت کی جاتی ہے تو اس فن کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکے گا، یعنی یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔''

(ماہ نامہ اشاعة الحدیث، شمارہ:۱۲۹-۱۳۲، ص:۱۳۶)

سوال ہے کہ یہ کیسا ''انصاف'' ہے جو محدثین نہیں کرسکے؟ انھوں

نے ''ناانصافی'' اور ''ظلم'' کیا؟ مولانا ندیم جو اصول متعارف کروا رہے ہیں کیا محدثین، جن کا اوڑھنا بچھونا ہی خدمتِ حدیث تھا، اس سے بے خبر رہے! کیا یہ ''سلف صالحین کے متفقہ فہم کا پرچار'' اور ''اجماع کی برتری'' ہے؟ یا یہ ''اصول'' ہی خانہ ساز ہے!

مولانا زبیر مرحوم بھی زندگی بھر محدثین کے ہاں قابلِ اعتماد کتب سے استدلال کرتے رہے، بلکہ العلل الکبیر بھی ان کے مراجع میں شامل تھی۔ وہ پہلے منہجِ محدثین پر چلتے رہے یا اس کتاب کا انکار کرنے کے بعد اسلوبِ محدثین پر گامزن ہوئے؟

❁ ...... ندیم صاحب نے کمال چالاکی سے خود ہی مغالطہ آمیز نتیجہ پیش کرتے ہوئے ''بوکھلاہٹ'' کے عنوان کے تحت لکھا:

''یعنی صحتِ کتاب کے لیے سند شرط ہے بھی اور نہیں بھی۔''

(ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث، شمارہ: ۱۲۹-۱۳۲، ص: ۱۳۶)

ہمارے مہربان کی ''کرم فرمائی'' یہاں بھی نظر آ رہی ہے۔ ہم نے صحتِ سند کی اہمیت کا انکار کب کیا ہے؟ البتہ ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر کتاب کے ثبوت کے لیے صرف یہی کسوٹی رہی تو محدثین کی قابلِ اعتماد بہت سی کتب سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جن کی حفاظت کے لیے ہم نے سات شرائط ذکر کیں۔ اگر وہ سبھی شرائط کسی کتاب میں موجود ہوں تو اس کتاب کی سند اور متن نہایت اعلیٰ درجے کی صحیح ہوگی۔ جتنی شرائط کم ہوتی جائیں گی اسی قدر صحتِ کتاب کا درجہ کم ہوتا جائے گا۔ ہم ہفت روزہ الاعتصام میں یہ لکھ چکے ہیں:

''جس کتاب یا مخطوط میں یہ شروط پائی جائیں تو اس کی نسبت میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ جتنی شرائط کم ہوتی جائیں گی اسی قدر اس کی حیثیت گھٹتی جائے گی۔''

(ہفت روزہ الاعتصام، جلد: ۶۷، شمارہ: ۲۴، ص ۲۱)

اب قارئین فیصلہ کر سکتے ہیں کہ محدثین کی کتابوں کا دفاع کون کر رہا ہے اور ان کی محنتوں اور کاوشوں کو کون رائیگاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟ منہجِ محدثین کی شاہراہ پر کون گامزن ہے اور کون اپنے شذوذ کی پگڈنڈیوں پر لڑھک رہا ہے؟

**ایک نظر ادھر بھی:**

جامع ترمذی اور العلل الکبیر کے مابین تعارض ثابت کرنے والے ایک نگاہ إمام العلل ترمذی پر بھی ڈالیے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"و سألت أبا زرعة و محمدًا عن هذا الحديث، فقالا: ليس بصحيح، لأن ابن المبارك روى هذا عن ثور عن رجاء. قال: حدثت عن كاتب المغيرة مرسل عن النبي ﷺ و لم يذكر فيه المغيرة."

(جامع ترمذي، رقم: ۹۷)

''میں نے ابوزرعہ (رازی) اور محمد (بن اسماعیل بخاری) سے اس حدیث کی بابت سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: وہ صحیح نہیں کیوں کہ اسے ابن المبارك عن ثور عن رجاء حدثتت عن كاتب المغيرة، عن النبی ﷺ مرسل بیان کرتے ہیں۔ اس میں مغیرہ (بن شعبہ) کا ذکر نہیں کیا۔''

امام ترمذی نے امام بخاری اور امام ابوزرعہ سے جو سند نقل کی ہے اس کے مطابق رجاء اور کاتب المغیرہ کے مابین "حدثت" مجہول واسطہ ہے۔ اس مقام پر یہ واسطہ ذکر کرنے والے امام ترمذی تنہا ہیں۔ جب کہ خود امام بخاری اس کے برعکس ثور بن یزید اور رجاء بن حیوہ کے مابین "حدثت" کا واسطہ ذکر کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

"و قال أحمد بن حنبل: حدثنا ابن مهدي حدثنا ابن المبارك عن ثور حدثت عن رجاء بن حيوة عن كاتب المغيرة بن شعبة. ليس فيه المغيرة." (التاريخ الكبير: ۸/ ۱۸۶، التاريخ الأوسط: ۳/ ۱۹۴، فقرة: ۳۳۰)

امام ابوزرعہ الرازی نے متعلقہ حدیث پر بحث کی ہے مگر جہاں سند پر گفتگو کی ہے وہاں کتاب میں سقط ہے، جیسا کہ محققینِ کتاب نے بھی وضاحت کی ہے۔ (ملاحظہ ہو العلل لابن أبي حاتم: ۷۸) معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی کو امام بخاری وغیرہ کے حوالے سے سند ذکر کرنے میں وہم ہوا ہے، جیسا کہ امام بخاری کی نقل سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ نیز امام احمد سے یہ سند ذکر کرنے والے امام بخاری تنہا نہیں بلکہ امام احمد کے مشہور ترین شاگرد بھی اسی طرح بیان کرتے ہیں:

①......امام ابوبکر احمد بن محمد بن ہانی الاثرم:

(ملاحظہ ہو التمهيد لابن عبدالبر: ۱/۱۳،۱۴،۱۱/۱۴۷۔ السنن الأبين لابن رشيد الفهري: ۱۲۲۔ الإمام في معرفة أحاديث الأحكام لابن دقيق العيد: ۲/۱۴۶۔ نصب الراية: ۱/۱۸۱،۱۸۲۔ البدر المنير لابن الملقن: ۳/۲۱۔ التلخيص الحبير: ۱/۱۵۹، حدیث: ۲۱۸، دوسرا نسخہ: ۱/۴۳، حدیث: ۱۵۷)

②......امام عبداللہ بن احمد:

(ملاحظہ ہو المحلی لابن حزم: ۲/۱۱۴۔ تہذیب سنن ابی داود لابن القیم: ۱/۱۲۴)

③......امام ابوالفضل صالح بن امام احمد:

(ملاحظہ ہو مسائل الإمام أحمد بن حنبل: ۲/۱۲۶ رواية ابن صالح. تاریخ بغداد: ۲/۱۳۵، ترجمہ: ۵۳۵)

امام ترمذی کے وہم کی تیسری دلیل یہ ہے کہ حافظ الدنیا دارقطنی نے اس کی سند اسی طرح بیان کی ہے جس طرح امام بخاری وغیرہ نے ذکر کی ہے۔ (العلل للدارقطني: ۷/۱۱۰، سنن الدارقطني: ۱/۱۹۵، حدیث: ۷، دوسرا نسخہ: ۱/۴۴۵، حدیث: ۷۴۲)

امام بیہقی نے اپنی سند سے امام دارقطنی کا قول سنن الدارقطني سے نقل کیا ہے۔ (السنن الکبری: ۱/۲۹۱، نیز دیکھیے معرفة السنن و الآثار: ۱/۳۵۱، تحت رقم: ۴۴۳)

ازاں بعد لکھتے ہیں:

''اسی طرح امام ترمذی نے امام بخاری اور امام ابوزرعہ الرازی سے نقل کیا ہے۔'' (السنن الکبری: ۱/ ۲۹۱)

ان کے اس قول کا مطلب ہے کہ امام ترمذی نے ان سے اس حدیث کا مرسل ہونا نقل کیا ہے۔ یہ مفہوم نہیں کہ باقی سند بھی اسی طرح بیان کی ہے جس طرح امام دارقطنی نے بیان کی ہے۔

امام ترمذی کے وہم کی چوتھی دلیل خود ان کی اپنی تحریری گواہی ہے، چنانچہ وہ العلل الکبیر میں لکھتے ہیں:

"سألت محمدا عن هذا الحديث، فقال: لا يصح هذا. روى عن ابن المبارك عن ثور بن يزيد قال: حدثت عن رجاء بن حيوة عن كاتب المغيرة عن النبي ﷺ مرسلا. و ضعف هذا. و سألت أبا زرعة، فقال نحوا مما قال محمد بن إسماعيل."

(ترتيب العلل الكبير: ۱/ ۱۸۰، رقم: ۳۵)

یہاں امام ترمذی نے ثور اور رجاء کے مابین "حدثت" کا واسطہ ذکر کیا ہے جو سبھی محدثین ذکر کرتے ہیں، جیسا کہ آپ ابھی پڑھ آئے ہیں۔ یہ بات بالکل عیاں ہوگئی کہ امام ترمذی کو جامع ترمذی میں وہم ہوا ہے اور العلل الکبیر میں صحیح لکھا ہے۔

راقم الحروف سے پیشتر اہلِ علم نے امام صاحب کے اس وہم کی نشان دہی کی ہے جو درج ذیل ہیں:

❶: محدثِ مصر احمد شاکر۔ (تحقیق الترمذی: ۱/۱۶۴) غالباً سب سے پہلے انھوں نے اس وہم کی نشان دہی کی ہے۔

❷: امام البانی: انھوں نے جامع ترمذی میں امام بخاری اور امام ابوزرعہ کے قول اور المحلی لابن حزم میں امام احمد کے قول کو مدغم کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سند دو جگہ سے منقطع ہے:

(ا)۔ ثور اور رجاء کے مابین، جیسا کہ امام احمد نے فرمایا ہے۔

(۲) رجاء اور کاتب المغیرہ کے درمیان، جیسا کہ امام ترمذی نے شیخین سے نقل کیا ہے۔(ضعیف سنن أبي داود:۹/۵۵)

ازاں بعد ان کا میلان بھی امام ترمذی کے وہم کی طرف ہو گیا۔(الضعیفة:۱۲/۱/۸۶)

❸: محققین مسند احمد۔(الموسوعة الحديثية:۳۰/۱۳۷)

❹: الشیخ ابوعمرو یاسر بن محمد فتحی آل عید۔(فضل الرحيم الودود تخريج سنن أبي داود:۲/۲۷۰)

❺: شیخ عبداللہ نوارۃ۔(تحقيق تحفة التحصيل في ذكر رواة المراسيل لأبي زرعة العراقي،ص:۱۰۶)

ڈاکٹر ماہر یٰسین فحل الشیخ احمد شاکر کی تردید اور امام ترمذی کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”انھیں وہم نہیں ہوا، جیسا کہ العلل الکبیر سے معلوم ہوتا ہے۔ترمذی میں ناسخ کی غلطی ہے۔“

(الجامع في العلل و الفوائد:۱/۲۷۳)

ڈاکٹر صاحب کا یہ موقف درست نہیں، کیوں کہ جامع ترمذی کا قدیم اور معتبر ترین قلمی نسخہ، جو نسخة الكروخي کے نام سے مشہور ہے، راقم الحروف کے سامنے ہے۔اس میں بھی اسی طرح لکھا ہے جس طرح مطبوع جامع ترمذی میں لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو نسخة الكروخي: ۱۰/ ب)

جامع ترمذی کی مستخرج میں بھی اسی طرح ہے۔ (ملاحظہ ہو مختصر الأحكام للطوسي، ص: ۴۸، رقم: ۷۸. تحفة الأشراف: ۸/ ۴۹۷. عارضة الأحوذي لابن العربي: ۱/ ۱۴۶. تحفة الأحوذي: ۱/ ۳۹۴، بيت الأفكار الدولية)

اسی پر بس نہیں، بلکہ امام ترمذی کے نقل کردہ قول سے حافظ علائی، حافظ ابوزرعہ العراقی اور حافظ ابن حجر بھی یہ سمجھے کہ امام بخاری اور امام ابوزرعہ، رجاء اور کاتب المغیرۃ کے مابین انقطاع کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔(جامع التحصيل للعلائي، ص: ۲۱۱، تحفة التحصيل، ص: ۱۰۶، تهذيب التهذيب: ۳/ ۲۶۶)

اس لیے مصنف کی غلطی کو ناسخ کے سر ڈالنا درست نہیں۔

**حافظ علائی کا وہم:**

ڈاکٹر ماہر فحل کی طرح شیخ یوسف بن محمد الدخیل بھی امام ترمذی کی نقل کی درستگی کی طرف گئے ہیں۔

(سؤالات الترمذي للبخاري: ۱/ ۳۰۷)

ان کی ایک دلیل امام ترمذی کی نقل ہے، دوسری دلیل امام احمد کا قول ہے جو اُن سے حافظ علائی نے ذکر کیا ہے:

”و قال أحمد بن حنبل: لم يلق رجاء بن حيوة ورّادا يعني كاتب المغيرة.“

(جامع التحصيل، ص: ۲۱۱)

یہی قول حافظ ابوزرعہ ابن العراقی اور حافظ ابن حجر نے بھی ذکر کیا ہے۔(تحفۃ التحصیل،ص:۱۰۶،تہذیب:۳/۲۶۶)

امام احمد کا یہ قول کہاں ہے، ان سے کس شاگرد نے نقل کیا ہے، حافظ علائی نے اس کی کوئی وضاحت پیش نہیں کی۔اور ہمیں بھی نہیں مل سکا۔ بنا بریں ہمارا رجحان حافظ علائی کے وہم کی طرف ہے۔آپ ابھی پڑھ آئے ہیں کہ امام احمد سے ان کے چار شاگردوں (امام بخاری، امام اثرم، امام عبداللہ اور امام صالح) نے ثور اور رجاء کے مابین ”حدثت“ کا واسطہ ذکر کیا ہے۔امام اثرم کی روایت میں صراحت ہے:

”و لم يسمعه ثور من رجاء.“(التمهيد: ۱/ ۱۳)

”یہ حدیث ثور نے رجاء سے نہیں سنی۔“

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

”فأفسده من وجهين: حين قال: حدثت عن رجاء، و أرسله و لم يسنده.“

(الإمام لابن دقيق العيد: ۲/ ۱۴۶)

''اس نے دو چیزوں کی بنا پر اِس کی صحت کو بگاڑ دیا:
(۱)جب کہا: حدثت عن رجاء، (۲)اسے مرسل بیان کیا اور مسنداً بیان نہیں کیا۔''

اس قول میں امام احمد حدیث میں صرف دو علّتیں ذکر کر رہے ہیں؛ پہلی علت ثور اور رجاء کے مابین انقطاع ہے۔ دوسری علت اس کا مرسل ہونا راجح ہے، یعنی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا واسطہ نہیں ہے۔

اگر رجاء اور کاتب المغیرۃ کے درمیان بھی انقطاع ہوتا تو یقیناً امام صاحب اسے دو علتوں میں محصور نہ کرتے۔

**ثانیاً**: یہ بھی احتمال ہے کہ امام احمد نے کسی اور روایت کے تحت اس انقطاع کی طرف اشارہ نہ کیا ہو۔ اسی کے پیشِ نظر ذخیرۂ حدیث کو کھنگالا تو معلوم ہوا کہ رجاء بن حیوۃ عن کاتب المغیرۃ ورّاد سے صرف دو روایات بیان کرتے ہیں۔ ہمارے اس دعوے کو تقویت حافظ الدنیا طبرانی کے قول سے بھی مل گئی کہ انھوں نے اپنی دو کتابوں ''رجاء بن حیوۃ عن ورّاد کاتب المغیرۃ'' کے عنوان کے تحت دو احادیث ذکر کی ہیں؛ ایک تو زیرِ بحث حدیث ((المسح أعلاه و أسفله)) ہے۔ دوسری حدیث نماز کے بعد ذکر سے متعلق ہے۔(المعجم الکبیر: ۲۰/ ۳۹۵، ۳۹۶، حدیث: ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹. مسند الشامیین: ۳/ ۲۱۷، حدیث: ۲۱۱۸، ۲۱۱۹، ۲۱۲۰)

ان دونوں حدیثوں میں سے پہلی حدیث پر امام احمد کا نقد موجود ہے، دوسری کے بارے میں ان کی کوئی جرح موجود نہیں، بلکہ اس حدیث میں رجاء بن حیوۃ کی متعدد متابعتیں صحیحین میں بھی موجود ہیں۔(صحیح بخاري، رقم: ۸٤٤، ٦٣٣٠، ٦٤٧٣، ٦٦١٥، ٧٢٩٢. صحیح مسلم، رقم: ٥٩٣)

اس لیے ایسی روایت پر امام احمد کا کلام کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

**ثالثاً**: درج ذیل محدثین نے ثور اور رجاء کے مابین انقطاع کی صراحت کی ہے:

(۱)امام ابوداود۔(سنن أبي داود، رقم: ١٦٥)
(۲)امام موسی بن ہارون الحمال۔(التلخیص الحبیر: ۱/ ٤٣٠)
(۳)امام بغوی۔ (شرح السنة: ۱/ ٤٦٣)
(۴)امام بیہقی لکھتے ہیں:

"إن الحفاظ يقولون: لم يسمع ثور هذا الحديث من رجاء بن حيوة."
(معرفة السنن و الآثار: ۱/ ٣٥١)

''حفاظ کا کہنا ہے: ثور نے یہ حدیث رجاء بن حیوۃ سے نہیں سنی۔''

امام ابونعیم لکھتے ہیں:

''یہ رجاء کی غریب حدیث ہے، اس سے یہ روایت صرف ثور بیان کرتا ہے۔''(حلية الأولياء: ٥/ ١٧٦)

اس لیے یہ مضبوط قرینہ ہے کہ محدثین نے ثور اور رجاء کے مابین انقطاع کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ بنا بریں حافظ علائی کا امام احمد سے رجاء اور کاتب المغیرۃ کے درمیان انقطاع ثابت کرنا درست نہیں۔

## دوسری مثال:

امام ترمذی کے وہم کی دوسری مثال پیشِ خدمت ہے:

اسماعیل بن رافع جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف راوی ہے۔ جب کہ امام ترمذی فرماتے ہیں:

"و إسماعيل بن رافع قد ضعفه بعض أصحاب الحديث، و سمعت محمدا يقول: هو ثقة، مقارب الحديث."
(جامع الترمذي، رقم: ١٦٦٦)

''اسماعیل بن رافع کو بعض محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ میں نے محمد (امام بخاری) کو فرماتے ہوئے سنا کہ وہ ثقہ اور مقارب الحدیث ہے۔''

امام بخاری کا یہ قول ان کی کتابوں میں موجود نہیں، امام ترمذی نے خود اُن سے سنا ہے۔ یہ قول متعدد محدثین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔امام ذہبی بھی یہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"و من تلبيس الترمذي ." (ميزان الاعتدال: ١/ ٢٢٧، تحت ترجمة: ٨٧٢)

یعنی امام ترمذی پر امام بخاری کا قول گڈ مڈ ہوگیا ہے۔انھوں نے تو کسی اور راوی کی تعدیل کی تھی جسے امام ترمذی نے اس راوی کے بارے میں سمجھ لیا کیوں کہ اس کی مرویات اور دیگر ناقدین کے اقوال اس کے ضعیف ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

**خلاصہ:**

ہماری سابقہ بحث کا لبِ لباب یہ ہے کہ جس کتاب کا مولف خود ثقہ یا کم از کم قابل اعتماد ہو، اس کتاب کی سند صحیح یا حسن ہو، محدثین کے ہاں وہ معتبر ہو، مخطوط کی صحت سے متعلق دیگر شرائط کا لحاظ رکھا گیا ہو، کسی خارجی قرینے سے اس کی صحت مشکوک نہ ہو تو یہ اعلیٰ ترین درجے کی صحیح کتاب ہوگی، یعنی نسبت کے لحاظ سے سو فیصد صحیح کتاب ہوگی۔

اور جس کتاب کی سند موجود ہو یا اس میں کوئی راوی ضعیف ہو، اس کے باوجود محدثین کے ہاں معتبر ہو، وہ اس کتاب کی نسبت پر جرح نہ کرتے ہوں، اس سے استدلال کرتے ہوں، کسی خارجی قرینے سے اس کا غلط ہونا بھی ثابت نہ ہو، اس میں کسی چیز کے زبردستی داخل کیے جانے کی دلیل بھی نہ ہو تو ایسی کتاب یا نسخہ قابلِ قبول ہوگا۔اس میں جس قدر ضعف ہوگا، اسی تناسب سے اس کی صحت اور ثقاہت میں کمی واقع ہوتی جائے گی۔

❀❀❀